انتساب

اپنی معصوم بیٹی

سیما

اپنے پیارے بیٹے

حسن پرویز

اور

اس کی خوبصورت کائنات

نگارینہ، اشہر اور شہیر

کے نام مستقبل کی بشارت اور بے شمار دعاؤں کے ساتھ

فہرست

	اظہارِ مدعا	۷ تا ۹
۱:	یادوں کی پرواہیاں	۱۰ تا ۱۷
۲:	انتظار	۱۸ تا ۲۶
۳:	وہ لڑکی	۲۷ تا ۳۲
۴:	دہشت گرد	۳۳ تا ۳۶
۵:	مہورت	۳۷ تا ۴۱
۶:	فریج کی عورت	۴۲ تا ۵۰
۷:	سفر زندگی کا	۵۱ تا ۵۷
۸:	غلط شرشک	۵۸ تا ۶۴
۹:	رشتے کی پہچان	۶۵ تا ۷۴
۱۰:	واہمہ	۷۵ تا ۷۹
۱۱:	الماری کی زینت	۸۰ تا ۸۶
۱۲:	چاند اور چکور کی کہانی	۸۷ تا ۹۷
۱۳:	دھند	۹۸ تا ۱۰۴
۱۴:	معجزہ	۱۰۵ تا ۱۱۳
۱۵:	کٹی پتنگ	۱۱۴ تا ۱۲۴
۱۶:	اجنبی دیار	۱۲۵ تا ۱۳۵

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

اظہارِ مدُعا

لکھنا اندر کی آواز ہے جسے دبایا نہیں جا سکتا ہے۔ نامساعد حالات میں یہ بھلے ہی وقتی طور پر دب جائے مگر اسے دبانے کی کوشش ہمیشہ خطرناک ثابت ہوئی ہے۔ یا تو یہ آواز کرب کی صورت میں ڈھل کر ناسور بن جاتی ہے یا ذہنی مرض کی علامت —— لہٰذا لکھنا ایک خداداد وصف ہے، یہ اُن خوش نصیبوں کو ملتا ہے جو ''قلم'' سے سچی محبت کرتے ہیں اور عبادت کی طرح ریاضت (مشقِ سخن) کو بھی اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے ہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ میں نے بھی اپنی تمام مصروفیتوں، الجھنوں اور پریشانیوں کے باوجود ''قلم'' کو زندہ رکھنے کی سعی ناچیز کی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ ہمارے قارئین نے اس کی پذیرائی نہیں کی ہے —— بلکہ یہ میری خوش بختی ہے کہ پہلا افسانہ ''جنونِ وفا'' مطبوعہ صبحِ نو پٹنہ فروری ۱۹۶۶ء سے ہی ادبی حلقے سے مجھے داد و تحسین کی وہ صدائے دلنواز ملی کہ مجھے لکھنے میں ایک خاص نوع کا ذہنی حظ ملنے لگا، ایک عجیب نشاطیہ کیفیت جس میں ہمیں یہ

احساس ہونے لگا کہ ۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی ——!

یہ خودی و بیخودی کا امتزاج، یہ کرب و نشاط کی کیفیت اور یہ تخلیقی کرب کچھ عجیب ہوتا ہے۔ جس کی لذت کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو اس راہ کے مسافر ہیں۔

کُل ملا کر اب تک ہمارے خیال میں کم و بیش ستر (۷۰) کہانیاں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ایک ناولٹ ''ٹھنڈی چھاؤں'' کے نام سے زیرِ ترتیب ہے، ویسے مجموعے دو منظرِ عام پر آچکے ہیں، ''چارہ گر'' دسمبر ۱۹۸۳ء و ''اجنبی چہرے'' ۱۹۹۱ء اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء۔ ''یادِ نگر'' ہنوز طباعت کے مرحلے میں ہے۔ اس لحاظ سے یہ چوتھا مجموعہ ہے جو بہار اردو اکادمی پٹنہ کے مالی تعاون سے ''پنجرے کا قیدی'' کے نام سے اشاعت کے خواب کی تکمیل میں ہے۔ اس میں شائع شدہ افسانوں کے علاوہ کچھ تازہ تر غیر مطبوعہ افسانے بھی شامل ہیں۔ اللہ کرے ہمارے قارئین کے ذوق و معیار پر یہ پورے اتر جائیں۔ ہماری محنت شاقہ کے لیے آپ کے دو چار بول ہی کافی ہیں۔ کتابوں کے گھنے جنگل اور اس مصروف تر زندگی میں کس کو اتنی فرصت ہے کہ وہ عہد عتیق کی طرح ادب یا ادیب کی بھرپور پذیرائی کر سکے۔

اس مجموعے کی اشاعت کے لیے میں بہار اردو اکادمی پٹنہ کے سابق سکریٹری جناب امتیاز احمد کریمی جو فی الحال ڈائرکٹر اردو ڈائرکٹوریٹ ہیں اور

اردو اکادمی کے دیگر اراکین کی خلوص دل سے ممنون و مشکور ہوں۔ اردو ادب کی خدمات ان حضرات نے جس سلیقہ سے کی ہے اس کے لیے وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ جشنِ اردو اور تقسیمِ انعامات و اعزازات کا جشن جس انداز میں منایا گیا ہے، مختلف سیمینارز وغیرہ میں ان حضرات کی انتظامیہ قوت جس طرح سامنے آئی ہے اسے میں اپنی زندگی کا خوبصورت لمحہ کہوں گی۔ جس کی یاد سے دل و دماغ میں ایک سرور کی کیفیت چھا جاتی ہے۔ پتہ نہیں یہ کس کا شعر ہے کہ ۔

دن تو آتے ہی گذر جاتے ہیں
یادیں رہ جاتی ہیں ڈسنے کے لیے

آخر میں اپنے عمو محترم پروفیسر علیم اللہ حالی جن کے سلسلے میں، میں یہی کہوں گی کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا، ممتاز افسانہ نگار مشتاق احمد نوری (حالیہ سکریٹری)، کمپوزر عزیزم اکرم فہمید ینی، ڈاکٹر مسعود الرحمٰن اور اپنے شریکِ سفر محمد بدر الحسن صاحب کی خاص طور پر ممنون ہوں کہ ان سبھوں کا تعاون کسی نہ کسی انداز میں مجھے حاصل رہا ہے۔

اپنے تمام قارئین سے یہ گذارش ہے کہ انصاف پر مبنی آراء سے نوازنے کی زحمت فرمائیں گے تاکہ ''قلم'' کو تحرک ملتا رہے۔ شکریہ!

قمر جہاں
۳۔ بھیکن پور، بھاگلپور-۸۱۲۰۰۱
موبائل: 94314 22270

یادوں کی پُروائیاں

یادوں کی پُروائیاں اتنی تیز چل رہی تھیں کہ ہر طرف زرد پتوں کا ڈھیر سا لگ گیا تھا —— کچھ دنوں پہلے تک یہاں پر کیسی ہریالی تھی لیکن دیکھتے دیکھتے یہ باغ زرد پتوں کا بن معلوم ہو رہا ہے، وہ سوچ رہی تھی ''کیا اب یہ پتے کبھی ہرے نہیں ہوں گے؟'' جواب میں اس کے اندر ایک آواز گونجتی ہے: ''بھلا درخت سے ٹوٹے پتے بھی کہیں شاداب ہوئے ہیں..... یہ تمنا ہی فضول ہے۔

آدمی بھی کیسا پاگل ہے، نہ جانے کیا کیا اس کا دل مانگتا ہے مگر دل کا مانگنا بھی کیا —— اب تو شاید پہلو میں وہ دل بھی نہیں رہا جو کسی کی تمنا کرے، کسی کے خواب دیکھے..... مگر کبھی کیسا ساون بھادو کا سا موسم تھا، نرم ہواؤں کے ساتھ بارش کی ننھی ننھی بوندیں جب اُس کے رخساروں کو چھوتیں تو وہ اندر سے کتنا خوش ہوتی تھی، بالکل معصوم بچوں کی طرح اس وقت دور کہیں جنگل میں اسے مور ناچتا ہوا محسوس ہوتا اور اس کا تن بدن بھی بند کمرے میں دریچے کے قریب بیٹھا مور کی طرح ناچتا رہتا —— ایسے ہی سنہرے لمحوں میں ایک بار اماں نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا: ''اری پگلی! اب تک سو رہی ہے کیا؟ شام کا اندھیرا پھیلتا جا رہا ہے، تو کمرے

سے نہیں نکلے گی؟'' اور پھر کچھ دیر تک وہ مُسلسل دروازہ پیٹتی رہی تھیں۔ تنگ آ کر اس نے دروازہ آخر کھول دیا اور جب اماں نے دیکھا کہ ان کی لاڈلی تو آدھا بھیگ چکی ہے تو وہ کتنے زور سے چلائی تھیں۔

''کم بخت! تو تو پورا بھیگ گئی ہے۔ واہ ری تیری نیند۔ واہ! ارے ذرا تو ہوش کر، چل فوراً کپڑے بدل ورنہ بخار چڑھ آئے گا۔ اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اماں کے خوف سے کپڑے بدل لی تھی، مگر دل میں سوچ رہی تھی: ''یہ اماں کو کیا ہو جاتا ہے ..... ایسے موسم میں بھی ان کے مزاج کی گرمی نہیں جاتی ..... موسم کی ساری لذت کو انہوں نے اپنی چیخ و پکار میں غارت کر دیا.....''

ایسے میں جب اسی وقت ابو باہر سے آئے تو وہ ان پر بھی برس پڑی تھیں: ''کتنی بار کہہ چکی کہ برسات میں چھتری لے کر باہر نکلو مگر آپ ہیں کہ نوجوانوں کی نقل کرتے ہیں..... باپ بیٹی دونوں کو جب بخار چڑھے گا تو.....

''تو موسم کا جادو سر چڑھ کر بولے گا اور کیا.....'' ابا نے اماں کے جملے کو اپنے خیال کے مطابق ڈھال لیا مگر اماں بے چاری شاید موسم کے جادو سے بالکل نا آشنا تھیں..... جبھی تو ابا کو بالکل سپاٹ آنکھوں سے گھور رہی تھیں.....

شاید اس کے ابا موسم کے جادو سے آشنا تھے، ان کی گفتگو سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ایسے موسم میں بور نہیں ہوتے بلکہ خوش ہو رہے تھے فضا کی طرح ذہن کی بھی ساری گرد اور آلودگی چھٹ گئی تھی اور ان کی مکدّر طبیعت پہلے سے زیادہ نکھری ہوئی تھی —— باپ بیٹی کے مزاج میں کہیں نہ کہیں تو یکسانیت ضروری ہے نا! —— آخر کیسے

معلوم ہو کہ وہ ایک شاعر اور ادیب کی بیٹی ہے۔ شاعر و ادیب جو بس ذرا سا میں خوش ہو جاتے ہیں اور ذرا سی الٹ پھیر میں اداس۔ ابا کے مزاج کی یہ دو رنگی اور زود حسی اس کے اندر بھی پوری طرح عود کر آئی تھی۔ مگر اس کی اماں ایکدم سے چکنا گھڑا تھیں جس پر کوئی بھی سیال چیز ذرا دیر کو بھی نہیں ٹھہرتی۔

"..... مگر پھر بھی ان دونوں نے کتنی کامیاب زندگی گذار لی ہے ——" وہ سوچتی تو اسے سخت حیرانی ہوتی کہ دو مختلف مزاج کے لوگ ایک بندھن میں بندھ کر ایک چھت کے نیچے کتنی پُرسکون زندگی گذار لیتے تھے مگر یہ آج کیا ہوتا جا رہا ہے؟ یہ اندر کی کیسی توڑ پھوڑ ہے جو بیشتر گھروں کو تباہی کے دوراہے پر لا کھڑا کر رہی ہے۔ اس کے کان میں کسی کی آواز گونج رہی تھی:

"—— میں نے کتنی بار آپ سے کہا میں یہ برداشت نہیں کر سکتا —— اگر آپ کو مصوری کا شوق ہی ہے تو علیحدہ سے کوئی کمرہ اپنے ماڈل بنانے کے لئے رکھ چھوڑیے..... یہ ہر طرف بکھرے ہوئے ساز و سامان....."

"آپ کیسے بدذوق ہیں جی .....! کہیں آرٹ سے بھی کوئی صاحب نظر.....!

"صاحب نظر اور بدذوق ..... ذرا زبان کو لگام دیجئے ....." اور پھر ذرا سی بات کو لے کر تو تو میں میں شروع ہو جاتی.....

"—— ارے جناب! یہ گھر ہے جنگ کا کوئی میدان نہیں ....." وہ جھنجھلا کر کہتی اور پیر پٹختی ہوئی تمام ماڈل کو فرش پر سے سمیٹتے ہوئے چھوٹے سے اسٹور روم میں

ٹھونس دیتی —— وہ جانتی تھی کہ اپنے بنائے ہوئے ماڈل کے ساتھ یہ اس کا ظالمانہ برتاؤ ہے، ایک آرٹسٹ کو یہ انداز زیب نہیں دیتا مگر وہ کرتی بھی تو کیا —— یہ گھر جو ان دونوں کا مشترک گھر ہے مگر مرضی تو کسی ایک کی ہی چلتی ہے یہاں ——

ایسے لمحوں میں اسے اپنے ابا حضور کی بہت یاد آتی —— انہوں نے اس کے آرٹ کو کیوں سراہا تھا۔ پہلے دن ہی اماں کی طرح اسے کیوں نہ ٹوکا تھا: ''بیٹی! یہ سب لڑکوں کے ذوق ہیں، لڑکیاں تو گھر گرہستی کو سلیقے سے سنبھال لیں یہی کافی ہے —— مگر اس کے اندر تو مردانہ ذوق نمو پاتا رہا اور ایک حد تک وہ گھر گرہستی سے دور ہوتی چلی گئی۔

Painting کے مقابلے میں جانا، انعام حاصل کرنا، مبارک باد گھنٹوں فون پر وصول کرنا، داد و تحسین کے خطوط کا سلسلہ یہ سب اُس کے محبوب اور پسندیدہ مشغلے تھے۔ اماں برابر چڑھتیں مگر ابا للکارتے ''ارے بیٹی! تو تو واقعی بہت اچھی آرٹسٹ ہے۔ یہ رنگوں کی آمیزش، یہ انتخاب واہ بھئی! کیا کہنا، واہ..... واہ ..... شاباش! تو تو اپنے باپ سے بھی آگے بڑھ گئی ہے بیٹی!.....''

ایسے تعریفی کلمے اس کے ذوق کو اور بھی مشتعل کرتے گئے اور وہ جنون کی حد تک آرٹ کی دنیا میں ڈوبتی چلی گئی.....

ایک دفعہ کی بات ہے وہ اپنے ابا حضور کے ساتھ (پینٹنگ) Painting کے کسی مقابلے میں جا رہی تھی —— ٹرین نے بہت لیٹ سے اسٹیشن چھوڑی تھی، جب وہ نئے شہر پہنچی تو ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا، وہ اندر سے تھوڑا گھبرائی ہوئی تھی۔

Painting کا پہلا مقابلہ تھا جس میں وہ شامل ہو رہی تھی، نئے شہر کے اسٹیشن پر گاڑی جیوں ہی لگی، آرٹسٹوں اور قدر دانوں کی ایک لمبی قطار ان دونوں باپ بیٹی کے استقبال کو کھڑی تھی، پلیٹ فارم سے باہر نکلتے ہی ایک بڑی سی جدید طرز کی گاڑی میں وہ دونوں ادب سے بٹھائے گئے اور شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں ان کے قیام و طعام کا انتظام کیا گیا تھا۔ کتنے لوگ اس سے ملنے کے لیے بیقرار تھے مگر ابا حضور کی پاسبانی، ہر وقت اس کے ساتھ رہی —— اور جب وہ اپنے گھر لوٹ کر آئی تو ابا نے ہنستے ہوئے کہا: ''بیٹی! عورتوں کا آرٹسٹ ہونا بڑی آزمائش کا مقام ہے۔''

''کیوں ابا!'' اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

''تم نے اس سفر میں دیکھا نہیں؟''

''کیا ابا؟'' وہ پھر بھولپن سے پوچھ رہی تھی۔ ابا کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھل رہی تھی —— ''اچھا تو تم نے بھی اپنی اماں کی طرح اپنے چکنا گھڑا ہونے کا ثبوت دے ہی دیا ——'' اس بار وہ زور سے قہقہہ لگائی:

''ابا! ہم عورتیں اتنی بدھو نہیں ہوتیں جتنا آپ مرد سمجھتے ہیں، ہم لوگ آرٹ اور عورت کے فرق کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے کام میں لگے رہنا چاہتے ہیں ——''

''واہ بھئی واہ! تو صرف اچھی آرٹسٹ ہی نہیں، صاحب دماغ بیٹی بھی ہے، مجھے تجھ پر واقعی فخر ہے۔''

''ارے کیا باپ بیٹی اپنی ہی تعریف میں لگے ہوئے ہو۔'' اماں نے

مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ کچھ فکر بھی ہے رات میں کیا کھاؤ گے؟''

''جو مل جائے گا ہم ہنسی خوشی کھالیں گے..... کبھی ہم نے تم سے کوئی شکایت کی ہے۔ آج تک جو جلا پکا تم کھلاتی ہو ہم کھا لیتے ہیں.....'' ابا نے اماں کو مکھن لگانا چاہا مگر اماں بھی کم ہشیار نہیں تھیں، بولیں۔ ''اب بازار میں مکھن کا بھاؤ بہت بڑھ گیا ہے، ایسی فضول خرچی کرو گے تو پچھتانا پڑے گا۔''

ابا اس بذلہ سنجی پر دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے: ''یہ گھریلو عورتیں بھی کبھی کبھی بڑا کمال کر جاتی ہیں۔ ان کی حاضر جوابی اکثر پڑھی لکھی عورتوں پر بھاری رہتی ہے.....''

ابا کے دفتر میں کئی عورتیں کام کرتی تھیں، ان سے گفتگو کے آداب انہیں خوب معلوم تھے۔ کچھ دیر کے لیے وہ اماں سے ان عورتوں کا مقابلہ کرنے لگے اور یہ سوچ کر یک گونا اطمینان انہیں ہوا کہ وہ ایک خوش نصیب مرد ہیں، جن کا گھر واقعی جنت کا نمونہ ہے۔

اماں کس قدر خدمت گزار عورت ہیں، راتوں میں اٹھ کر ابا حضور کی خدمت کرتے ہوئے ان کی پیشانی پر کبھی شکن نہیں آئی —— رمضان میں خود روزے سے ہوتیں مگر ابا حضور ذیابطیس کے سبب روزہ رکھنے سے معذور تھے۔ اماں دن کے کھانے بناتیں، ٹفن ساتھ دیتیں، حالانکہ وہ خود بیمار رہتیں مگر یہ کیسا رشتہ تھا جہاں اپنے سارے دکھ درد کو بھول کر کسی کی خاطر جینا ہی زندگی بن جاتی ہے —— کبھی کبھی اسے اماں پر افسوس بھی ہوتا ''واقعی ان کا وجود اس گھر کے لیے

مشین کا ایک ضروری پرزہ بن کر رہ گیا تھا..... اگر یہ پرزہ دو دن کے لیے بھی کام کرنا چھوڑ دے تو سارا گھریلو نظام ہی درہم برہم ہونے لگتا تھا.....''

اکیسویں صدی میں داخلے کے بعد وہ اپنی موجودہ صورتحال سے خوش ہونے کے باوجود بہت مطمئن نہیں تھی:

''کیا آج بھی ہم عورتوں کا وجود اپنے گھر کے لیے ایک اہم پرزے کی حیثیت رکھتا ہے؟'' ایک ناقابل حل سوال اس کے دماغ پر مسلسل ہتھوڑے برسا رہا تھا۔

۸ر مارچ ۲۰۱۴ء ''انٹرنیشنل ویمینس ڈے'' کے کسی خاص پروگرام میں شرکت کے لیے وہ تیار ہو رہی تھی۔ قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑی اپنی لپ اسٹک کو مخصوص زاویہ دیتے ہوئے آج اور کل کے تقابل میں عورتوں کی بدلی ہوئی صورت حال کا وہ معائنہ کر رہی تھی اسے معاً احساس ہوا جیسے بہت تیزی سے ہندوستان کے بھولے بھالے، نیچرل مناظر سے بھرپور صحت بخش گاؤں، دھواں اور دھول بھرے شہر میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں جہاں Pollution اس قدر بڑھ گیا ہے کہ Environment Education کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ جب صحت ہی نہیں تو.....؟

باہر پورٹیکو سے ہارن کی آواز متواتر آ رہی تھی، دیوار گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے:

''—— اوہ! اچھی خاصی دیر ہو چکی ہے..... ڈرائیور کب کا آ چکا ہے۔ کیچن..... بچے..... گھر..... خاوند..... ابھی کچھ بھی نہیں..... ورنہ بہت دیر

ہو جائے گی..... پروگرام ختم کہیں نہ ہو جائے..... وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔ ڈرائیور سیلوٹ بجاتا ہوا کار کے پچھلے دروازے کھول کر موٴدب کھڑا ہے —— وہ گاڑی میں بیٹھ جاتی ہے اور ہمیشہ کی طرح ''جلدی سے چلو'' کہہ کر وہ دیر تک سوچتی رہ گئی:

''—— کیا آج کی عورت بھی اپنے گھر کے لیے وہی قیمتی پرزہ ہے جس کے بغیر گھر گھر نہیں.....؟''

☆☆☆

انتظار

آنکھ کھلی تو اس کا بستر خالی تھا، اسے یاد آیا بچی تو شاید رات دادی کے ساتھ سو گئی تھی —— اس نے لیمپ کی ہلکی زرد روشنی میں دیوار گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی تو رات کے بارہ ہی بجے ہیں، اتنی جلد وہ سو بھی گئی اور جاگ بھی گئی —— اب بھلا نیند کیسے آئے گی —— ؟ اپنی اُداسی اور تنہائی اُسے کھلنے لگی۔ کچھ دیر پہلے وہ کیسی خوشگوار نیند سو رہی تھی، وہ کہاں پہنچ گئی تھی، اپنے گھر میں —— جو، اب اس سے کافی دور ہو چکا ہے۔ جب سے جنگ کے بگل بج گئے تھے۔ اسے اپنا مائیکہ —— وہاں کے لوگ ہمیشہ کے لیے بچھڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کوئی ہندوستانی بھلا کب چاہے گا —— کون اپنے سر کو اس کی خاطر اکھلی میں ڈالے گا —— شاید وہ بھی نہیں چاہے گی کہ ایسے منتشر ماحول میں وہ اس دیس کو اپنا وطن کہے جو اس کا وطن ہوتے ہوئے اب اس کے لیے پرایا ہی نہیں، اجنبی ہی نہیں، دشمن ہوا جا رہا ہے —— مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ان دو قریبی دیسوں میں دشمنی آخر کس بات کی ہے —— ؟ یہ رشتے سلجھتے سلجھتے پھر کیوں الجھ گئے —— وقتی طور پر یہ سن کر وہ کیسی مسرور ہوئی تھی، اس کا خاوند بھی کتنا ہشاش بشاش تھا۔ اسی نے اسے بتایا تھا:

''سنتی ہو تہمینہ! اب ویزا اور پاسپورٹ اٹھ جائے گا، جب جی چاہے گا تم اپنے میکے گھوم آؤ گی——'' مگر یہ خواب، خواب ہی رہ گئے—— آج سویرے جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو وہ کچن سے دوڑ کر لپکی، وہ اپنے ابا حضور (خسر صاحب) کے لیے ٹی پاٹ سے چائے انڈیل رہی تھی، اُسے اتنا بھی برداشت نہیں ہو سکا کہ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی، پہلے چائے تو دے لے، گھنٹی تو بجتی رہے گی اور اگر کٹ بھی گئی تو پھر آ جائے گی، مگر ایسے موقعوں پر پتہ نہیں کیوں وہ ایسی بے اختیار ہو جاتی ہے کہ کبھی کبھی بچوں کی سی حرکت کر جاتی ہے۔ شاید ایک بچی کی ماں بن کر بھی وہ ابھی تک بچہ ہے۔ ریسیور اس کے ہاتھ میں تھا، ممی کی نحیف آواز اس کی سماعت کو چھو رہی تھی: ''بیٹی! تمہارے ابو کی حالت بہت سیریس ہے، بیمار تو وہ برابر تھے مگر اس بار.....'' ممی پھپھک پھپھک کر رو رہی تھیں اور دوسری طرف بیٹی نزدیک ہوتے ہوئے بھی، اتنی دور، اتنی مجبور تھی کہ صرف تڑپ کر رہ گئی—— چائے ملنے میں جب کافی دیر ہو گئی تو سسر جی بستر سے اٹھ کر کچن میں پہنچ گئے تھے اور خود سے چائے بنانے کی کوشش کر رہے تھے—— انہیں حیرت اور غصہ بھی آ رہا تھا کہ ''یہ کیسی لاپرواہی آ گئی ہے بہو میں—— کہ دودھ اور چینی کا بھی کچھ خیال نہیں—— اور اللہ جانے وہ کیا کیا سوچ رہے تھے کہ اُسے دیکھ کر ٹھٹھک گئے—— بہو کی آنکھوں میں آنسو کی لڑیاں بن بن کر ٹوٹ رہی تھیں، جنہیں وہ اپنے دوپٹے کے پلو میں چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی—— ''کیوں، کیا ہوا——؟ خیریت تو ہے——؟''

''بابا کی حالت ــــ بہت سیریس ہے ــــ وہ ہسپتال میں ــــ'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بتا رہی تھی اور دوبارہ چائے بنانے میں مصروف ہو چکی تھی ــــ وہ اس کے سر پر شفقت کے ہاتھ پھیرتا ہوا شرمسار لہجے میں اُسے تسلی دے رہا تھا: ''کیا کرو گی بیٹی! ہر آدمی کی عمر کا ایک وقت ہوتا ہے، ہم لوگ اب پکے ہوئے آم ہیں، کب پیڑ سے گر جائیں کچھ کہنا مشکل ہے ــــ'' پھر کچھ وقفے کے بعد ''آج میں زاہد سے تمہارے ویزا پاسپورٹ کے سلسلہ میں بات کرتا ہوں ــــ ذرا مجھے دفتر میں یاد دلا دینا ــــ''

''شکریہ ابا حضور!'' اس نے متشکر نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے چائے کی پیالی اُن کے ہاتھوں میں تھما دی، اس گھر میں اس کے جذبات کا لحاظ سب سے زیادہ شاید ابا حضور کو ہی ہے۔

شام میں جب اُس نے ویزا کے لیے پوچھا تو انہوں نے متفکر لہجہ میں جواب دیا:

''بیٹی! ان دنوں دونوں ممالک کے رشتے پھر بگڑ گئے ہیں، ابھی وہاں جانا دانشمندی نہیں ہے ــــ لوگ بتا رہے تھے کشمیر کو لے کر ــــ

''بھاڑ میں جائے یہ کشمیر ــــ'' اس نے جھنجھلا کر دل ہی دل میں سوچا'' کشمیر سبھوں کے لیے ''جنت نشاں'' ہے مگر میرے لیے تو جہنم زار ہے۔ جس کو لے کر دونوں ملک کے تعلقات برابر گڑبڑ رہتے ہیں۔ کاش! ابو نے شادی سے پہلے اس پہلو پر بھی غور کیا ہوتا ــــ'' اِدھر کچھ دنوں سے اپنے والدین کی جدائی اُسے بہت کھل رہی تھی، خاوند بھی اکثر چڑ چڑا یا رہتا۔ نوکری پیشہ کے لیے تو اور بھی آفت

ہے، وہ بھی سرکاری ملازم۔ دونوں ملکوں کے بیچ جب عام خطوط سنسر ہوتے ہیں تو بھلا فون کا آئے دن آنا اور اس کی بیوی کا وہاں برابر جانا کیا شک وشبہات کے جال نہیں پھیلا سکتا——؟'' وہ اکثر سوچتا کبھی کبھی بیوی پر اظہار بھی کر دیتا'' دوست دشمنوں کا کیا ٹھکانہ ہے—— کب کس کو کس بہانے پھنسا دے—— اسے اپنے بے قصور دوست کا محض شک کی بنا پر معطل کر دیا جانا اکثر یاد آجاتا، نوکری سے برطرفی اور مسلسل جرح وتکرار سے بیچارہ ابنارمل سا ہو گیا تھا، کتنے دن لگ گئے اُسے اپنی صفائی پیش کرنے میں—— وہ اکثر بیوی کو سمجھاتا۔ ''تم سمجھدار ہو، ان پہلوؤں پر بھی ذرا غور کرو تہمینہ! عام عورتوں کی طرح صرف جذبات میں نہ بہو——'' وہ کبھی ان باتوں کو سمجھتی اور کبھی سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہتی—— وہ اندر سے ایسی بے اختیار ہو جاتی کہ—— عقلمندی کی ساری باتیں لمحہ بھر کو بھول جاتی، اس کی خواہش ہوتی کاش! وہ اڑتی ہوئی مخلوق ہوتی اور جب سب لوگ سو جاتے تو وہ اڑ کر وہاں پہنچ جاتی اور سبھی اپنوں سے مل ملا کر اُڑان بھر کر پھر واپس اپنے گھر کو آجاتی۔ اُسے کہانی کی وہ پری یاد آجاتی جو سوتے ہوئے خاوند کو چھوڑ کر ہر رات راجہ اندر کی محفل میں جا کر ناچتی تھی اور صبح ہوتے ہی واپس آکر بستر میں سو جاتی مگر شہزادی کا انجام کتنا کربناک تھا۔ وہ ٹھنڈی آہیں بھر کر انجام پر غور کرتی مگر کچھ ہی دیر میں پھر پرانی ڈگر پر سوچنے لگتی۔

''بابل کے گھر اور پیا کے گھر میں تو پیار اور اپنا پن کا رشتہ ہونا چاہیے تھا مگر وہ بدنصیب تو شروع سے ہی .....'' اسے اپنے نکاح کا وہ مبارک دن یاد آیا

جب دو دیسوں کے درمیان دولہا دلہن دونوں سجائے گئے۔ بارات آئی، ڈھول باجے بجے مگر دولہا دلہن میں ملاپ ہوا تو کہاں، بھلا ٹیلیفون کے وائر پر ــــ لوگ باگ قہقہے لگا رہے تھے اور وہ اُداس تھی، سنجیدہ تھی، جذبات اتھل پتھل ہو رہے تھے مگر صرف الفاظ ایک دوسرے کو سنائی پڑ رہے تھے ــــ ''قبول کیا ــــ؟ ہاں میں نے قبول کیا ــــ'' دونوں فریقین کے رشتے کو قبول کر لینے کے بعد ہر طرف سے مبارکبادیاں دی جانے لگی تھیں مگر وہ اس روز بھی رو رہی تھی ــــ اور آج بھی اس کی آنکھوں میں پچھتاوے کے آنسو ہیں ــــ صبح کے نو بج رہے تھے۔ بیٹی بستر سے اتر کر ''امی امی'' کہہ کر رونے لگی۔ وہ اپنا رونا بھول کر اپنی بیٹی کے آنسو پوچھنے لگی، نہلا دھلا کر اس کے منہ میں دودھ کی بوتل دے کر وہ خود بننے سنورنے لگی تھی کہ اس گھر میں کوئی اُسے اُداس دیکھنا نہیں چاہتا ہے۔ اُسے اُداس اور غم زدہ دیکھ کر پورے گھر کا مزاج مضمحل ہو جاتا ہے۔ دراصل اس گھر میں اب اس کی حیثیت اس اہم پُرزے کے جیسی تھی جس کے ذرا دیر بیٹھ جانے سے خانہ داری کی مشین ہی گھڑ گھڑانے لگتی ہے۔ کوئی دوسرا پرزہ گھر داری کی اس مشین کو اس طرح بحسن وخوبی چلا ہی نہیں پاتا ــــ اس کے خاوند سے زیادہ اس کے گھر کے اور لوگ اس کے محتاج ہو گئے تھے۔ خاوند تو برابر باہر ہی باہر رہتا ہے، نوکری ہی جو ایسی تھی ــــ اپنے ساتھ بھی نہیں رکھ پاتا کہ ہر وقت ٹور میں وہ بیوی کو کہاں کہاں ڈھوتا چلتا۔ شاید گھریلو ذمہ داری سے بھاگنے کا یہ بھی ایک اچھا طریقہ تھا ــــ وہ کبھی کبھار جاتی بھی تو ہوٹل میں ایک ڈیڑھ ہفتہ رہ کر اسے واپس اصلی گھر آنا پڑتا

جہاں ساس اور سسر اس کے انتظار میں آنکھیں بچھائے ہوتے۔ اب وہ انہیں لوگوں کے پیار میں اپنا ہر غم غلط کرنا سیکھ گئی تھی مگر آج تو —— آج تو —— پھر وہ بے اختیار تھی ''ابو، میرے اچھے ابو، بیٹی کا انتظار کرنا، وہ ہر باندھ کو توڑ کر تم سے ملنے ضرور آئے گی —— ابو میرے پیارے ابو ——'' وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہی تھی اور آنکھیں موسلا دھار بارش کا سماں پیش کر رہی تھیں —— اس نے سوچا وہ اپنے خاوند کو فون کر کے بتا دے کہ ''خدارا! ایک بار تو ساتھ چل کر ابا اماں کو خوش کر دو، ہم دونوں کی جوڑی کو انہوں نے صرف تصویر میں ہی دیکھا ہے —— اب تو ایک بچی کے باپ بھی ہو گئے، ایک باپ کے جذبات کو سمجھنے کی ——'' پھر اُسے لگا یہ سب احمقانہ باتیں ہیں، اس کا خاوند بڑے مضبوط دل گردے کا آدمی ہے یا پھر اس کی مجبوری نے اسے پتھر دل انسان بنا دیا ہے —— اُسے یاد آیا شادی کے فوراً بعد وہ کتنے پیار سے اُسے اپنی مجبوری بتاتا تھا لیکن اِن دنوں تو وہ فوراً گرم ہو جاتا ہے۔ اچھی سی اچھی بات گرم توے پر گرتی ہوئی بوند کی طرح بخار بن کر اڑ جاتی ہے اور کہنے والا اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے —— اس کی ماں نے ایک بار کچھ کہا تھا تو کس قدر تلخی سے اس نے جواب دیا تھا:

''آپ لوگوں کو بچپن میں لگی ہوئی منسوب کا اگر اتنا ہی لحاظ تھا تو پھر ان تمام لوگوں کو ہی یہاں بسا لیتے یا پھر خود ہی وہاں جا بستے —— یہ تو آسان نہیں تھا، آسان تو صرف شادی کر دینا تھا —— دل ملے یا نہ ملے، مگر شادی ضرور ہو ——'' وہ اکثر غصے کی حالت میں ایسی بہکی بہکی باتیں اپنی بیوی کو بھی بلا جھجک کہہ سناتا تھا —— شاید اسی لیے

اب وہ اپنا درد کسی سے بانٹتی نہیں، وہ جانتی تھی کہ یہ درد، بس اسی کا مقدر ہے۔ اس لیے جب کبھی والدین کے فون آتے تو تھوڑی دیر وہ چھپ کر آنسو بہا لیتی۔ پھر نارمل ہی نہیں بالکل نارمل ہو جاتی —— مگر آج اپنے ابا حضور کی سیریس بیماری کا سن کر وہ بے قابو ہو رہی تھی، اور فوراً پنکھ لگا کر اڑ جانے کو تیار تھی۔ گھر والے بھی جانے کی اجازت فوراً ہی دے چکے تھے مگر پاسپورٹ ویزا —— ساتھ کون جائے —— چھوٹی بچی —— یہ سب انگنت بکھیڑے تھے جن کو حل کرتے کرتے بھی تقریباً بیس دن لگ ہی گئے —— ساتھ جانے کے لیے بھی خاوند کا چھوٹا بھائی تیار ہو گیا تھا —— وہ اپنی بچی کے ساتھ جانے کی پوری تیاری کر چکی تھی، کبھی خوش ہوتی کبھی اُداس، کبھی موجودہ ملکی حالت کو محسوس کر کے خوف کھاتی اور کبھی نڈر ہو کر سوچتی ''جانا تو ہے ہی، ماں باپ سے بڑی کوئی چیز ہے دنیا میں ——'' اِدھر ایک مدت سے ان لوگوں کے خطوط بھی یہاں نہیں آ رہے تھے، دراصل اس نے خود ہی منع کر دیا تھا اور بظاہر خود بھی ترکِ تعلق بنا رکھا تھا۔ دراصل جب سے اس کے خاوند کا دوست محض شک کی بنا پر مبتلائے بلا ہوا تھا، گھر کے تمام لوگ چوکنا ہو گئے تھے —— کونے کھدرے میں جہاں جہاں اس کے مائیکے کے خطوط چھپے ہوئے تھے، کئی روز کی کھوج کھاج کے بعد ان تمام خطوط کو یکجا کر کے آگ دکھا دیا گیا۔ اس وقت اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی لیکن وہ سب کچھ بڑے صبر سے سہہ گئی تھی کہ اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا —— پیار کو دھوئیں اور سیاہی میں بدلتے دیکھ کر اس کے دل سے آہ نکلی تھی —— ''کاش! وہ ان دونوں پڑوسی ملکوں کے رشتے کو خوشگوار بنا سکتی —— اس نے کبھی سوچا تھا اس کے جب دو

بیٹے ہوں گے تو ایک کا نام وہ ہندوستان رکھے گی اور دوسرے کا پاکستان۔ کتنی مماثلت ہے دونوں ناموں میں، مانو واقعی دونوں بھائی جو لڑ جھگڑ کر پھر ایک ہو جاتے ہوں ـــــ مگر اب تو ایسا لگتا ہے اس کی یہ حسرت ـــــ حسرت ہی رہ جائے گی ـــــ''

کل صبح اسے دہلی کے لیے روانہ ہونا ہے اور پرسوں شام میں ہی وہاں کے لیے فلائٹ کا ٹکٹ لیا جا چکا ہے۔ وہ اپنے سسر، ساس اور دیور کی بیحد ممنون و مشکور تھی جن کی انتھک کوششوں سے سب کام جلدی جلدی ہو گیا تھا ـــــ ننھی بچی کو بار بار دادی پیار سے چوم رہی تھیں اور بہو کو مستقل سمجھا رہی تھیں ''جلدی آ جانا بیٹی، تمہارے بغیر تو یہ گھر ـــــ گھر ہی نہیں لگتا ہے ـــــ'' وہ ہنس کر جواب دیتی۔

''ہاں ممی! میں خود اس بات کو سمجھتی ہوں مگر اس بار پتہ نہیں کیوں میں اندر سے بہت نروس ہوں ـــــ ارشد آئیں گے تو آپ لوگ بھی کوشش کیجیے گا کہ کم از کم ایک بار وہ بابا حضور کی موجودگی میں اپنی سسرال ہو لیں ـــــ ابا کی بے حد خواہش ہے انہیں دیکھنے کی ـــــ'' اس کا جملہ مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ دیور نے ڈانٹ پلائی ''آپ پھر بچوں جیسی باتیں کرنے لگیں بھابھی! کیا آپ نہیں جانتیں ـــــ؟'' تلخ جواب سن کر اسے برا تو لگا مگر وہ تو اس کی عادی ہو چکی تھی، اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور اپنے خوابوں کی دنیا کو ایک بار پھر اپنے ہاتھوں سے ادھیڑ رہی تھی کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی ـــــ اس نے ہڑبڑا کر بے وقت آئی ہوئی گھنٹی کو لبیک کہا اور ٹیلیفون کا چوغہ ہاتھ میں سنبھالتے ہوئے ہی وہ بے بسی سے رونے لگی تھی: ''ہائے ابا حضور چل بسے ـــــ اب تو میں مرا ہوا چہرہ بھی نہ دیکھ پاؤں گی، اللہ میاں کم از کم تین دن کی زندگی تو

اور دے دیے ہوتے ــــ'' جھر جھر آنسو اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ دوسری جانب سے درد بھری آواز آ رہی تھی ــــ مرتے وقت بھی ان کی آنکھیں دروازے پر ہی لگی ہوئی تھیں ــــ اور زبان پر تمہارا نام ــــ'' روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں، وہ ٹیلیفون اپنی ساس کے ہاتھوں میں تھما کر خود نہایت بے صبری کے عالم میں مصلیٰ بچھا کر دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھا چکی تھی، اس کے کانوں میں باپ کی پیاری آواز گونج رہی تھی اور دماغ شائیں شائیں کر رہا تھا۔

☆☆☆

وہ لڑکی

شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ فوگ بلب کی زرد زرد سی روشنی میں اس لمحہ ساری کائنات اسے اداسی کے ساگر میں ڈوبتی نظر آ رہی تھی۔ اس کی نظر کے سامنے پتھر کے بینچ پر بیٹھی ہوئی ایک جواں سال لڑکی بغل میں بیٹھی ہوئی بوڑھی اور مضمحل عورت کے کندھے سے سر ٹکائے بار بار ایک ہی بول کو دہرا رہی تھی —— ''ممی! میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ مجھے ڈائیوورس (Divorce) دلا دو نا.....'' وہ معصوم جو Divorce کا لفظ بھی صحیح طرح ادا نہیں کر پا رہی تھی۔ شاید لفظ Divorce کے معنی و مفہوم سے بھی بے خبر تھی، بار بار اسی ایک جملے کو دہرا رہی تھی۔ اس نے سوچا یقینی یہ آج کل کے غلط TV سیریل کا اثر ہے۔ کتنے مہلک اثرات سے نئی نسل دوچار ہے۔ کیا آج ہماری زندگی صرف تجارت ہو کر رہ گئی ہے.....؟

اس کی خواہش ہوئی کہ وہ case کی گہرائی میں جائے اور اس نوجوان لڑکی کے مریض ذہن کا اصل سبب دریافت کرے مگر کسی اجنبی سے اس طرح سر راہ قریب ہونا بھی تو مناسب نہیں ہے۔ پتہ نہیں وہ لوگ کیا سوچیں..... وہ خاموشی سے ان کے حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اسے یہ اندازہ لگانے میں کامیابی ہوئی کہ بوڑھی

عورت جو انتہائی تھکی ہوئی معلوم پڑتی تھی، اس جواں سال لڑکی کی ماں تھی۔ اس کے پہلو میں ایک اور اس کی عمر سے بڑی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی، غالباً وہ اس کی بھاوج تھی اور ایک اسمارٹ سا نوجوان، جوان لوگوں سے کچھ دور چہل قدمی کر رہا تھا، اس کا بھائی تھا۔ چہرے بشرے سے سب کس قدر شریف اور کلچرڈ معلوم ہو رہے تھے مگر ہر چہرے پر اداسی کی دبیز پرت پڑی تھی.....

''ممی میں نے غلط فیصلہ لے لیا نا؟ ابھی مجھے شادی کے لئے ہاں نہیں کہنا چاہئے تھا..... بھابھی! آپ نے بھی تو منع نہیں کیا، اب مجھے علیحدہ کروادو نا بھابھی .....'' اس کی آواز میں انتہائی التجا اور گہرے درد کا احساس تھا۔ وہ بدچلن اور آوارہ بھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہی باتیں کسی Abnormal ذہن کی پہچان ہے؟ پھر یہ لوگ من روگ و بھاگ کے دروازے پر کیوں بیٹھے ہیں——؟ دیکھنے میں لڑکی کہیں سے بھی Abnormal نہیں لگ رہی تھی۔ نہ تو اس کا Behaviour ہی Abnormility کی جھلک دکھا رہا تھا..... بہت دیر تک وہ خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا مگر اب اس سے خاموش نہیں رہا جا رہا تھا، وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس نوجوان کے قریب گیا اور جاتے ہی دریافت کرنے لگا——

''آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟''

''بہار سے——؟'' جواب مختصر تھا۔

وہ لڑکی آپ کی سسٹر ہے؟ سوال کا سلسلہ اپنا دائرہ بڑھا رہا تھا۔

''ہوں'' ..... جواب پہلے سے بھی ناتشفی بخش تھا۔

اسے کیا مرض ہے؟ دیکھنے میں تو ایک دم بھلی چنگی ہے..... باتیں بھی ہوش گوش کی کرتی ہے.....

اس بار بھی وہ لمبی ہوں کہہ کر خاموش ہو گیا..... تو اسے فکر ہوئی کہ اب موضوع کو کیسے آگے کھینچا جائے۔ یہ تو ربر کی ڈور کی طرح جہاں سے کھینچا جاتا ہے پھر وہیں پر پہنچ جاتا ہے۔ کچھ وقفے کی خاموشی کے بعد اس نے چہرے پر دکھ کے تاثرات لاتے ہوئے کہا:

"فکر نہیں کیجئے بھیا! سب صحیح ہو جائے گا، بس ایشور کی کرپا چاہئے۔ آپ یہاں آنے کی بجائے کسی مندر و مسجد، کسی مولوی پنڈت کے دوار پر....." بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ اس لڑکے نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا اور دھیرے سے بولا..... "مجھے افسوس ہے کہ آپ خواہ مخواہ کے لئے پریشان ہو رہے ہیں..... بن مانگے مشورہ دینا مناسب نہیں ہے....."

نوجوان کے تیکھے تیور کو دیکھ کر وہ فوراً اپنی جگہ پر واپس لوٹ آیا اور سوچنے لگا۔ بہن تو بہن بھائی بھی کچھ کم Abnormal نہیں..... بھلائی کی بات کا بھی برا مان لیا اس نے.....

ڈاکٹر کو آنے میں کافی دیر ہو رہی تھی۔ مریضوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ لڑکی بھی بڑی اکتائی ہوئی سی اس کو دیکھ رہی تھی، اس کی معصوم نگاہوں میں زندگی کے لئے ایک ایسی بے کیفی جھلک رہی تھی اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس پر شباب عمر میں جہاں زندگی ہنستی اور مسکراتی ہے، کلی پھول بنتی ہے..... یہ لڑکی دکھ کے ساگر میں غوطہ

لگا رہی ہے.....

''ہے بھگوان! آج ہم کس دور میں آ گئے ہیں'' وہ اپنا دکھ بھول چکا تھا اور اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا..... جو ہر طرح سے صحیح سالم، خوبصورت اور صحت مند لگ رہی تھی مگر .....مگر یہ ذہنی روگ.....؟؟

اے کاش! کوئی اس نادان کے دل کی بات کو بھی تو جانے، اس کے پرابلم کو سمجھے..... آخر وہ کیوں اپنی بیاہتا زندگی سے اکتا رہی ہے۔ یہ تمام لوگ اسے نصیحت کر رہے ہیں..... یہ بری بات ہے بھئی..... ایسا نہیں کہتے..... تمہارا خاوند بہت اچھا ہے..... تم ایسا کرو گی تو ہم تمہیں گھر سے نکال دیں گے..... وغیرہ وغیرہ..... کبھی گرم لہجہ تو کبھی نرم لہجہ، کبھی ناصحانہ انداز تو کبھی حاکمانہ و ظالمانہ برتاؤ..... بہت دیر تک ان لوگوں کی نصیحتیں سنتے سنتے وہ ایک بار پھر اپنے آپ کو روک نہیں سکا اور دھیرے سے مخاطب ہوا۔

''ماں جی! برا نہ مانئے تو ایک بات کہوں؟''

بوڑھی عورت نے سر اٹھا کر سوالیہ نگاہوں سے اسکی طرف دیکھا؟

کچھ لمحے تک وہ خاموش رہا پھر ہمت جٹا کر بولا:

''ماں! میری مانو تو اب اسے سمجھاؤ نہیں، اسے سمجھو، تم ماں ہو نا؟ دکھ کا کارن جانو..... نصیحتیں تو سب کرتے ہیں مگر.....'' ایک گہری نظر اس لڑکی پر ڈالتے ہوئے ''.....مگر ویاکل من نصیحت سے نہیں..... پیار سے شانت ہوتا ہے.....'' ایک بار پھر بھرپور ہمدردی سے اسے دیکھتے ہوئے:

''اسے پیار چاہئے..... پیار..... ایسا پیار کہ یہ اپنا سب دکھ بھول جائے..... تم اسے صرف دوا کھلا رہی ہو شاید..... من روگی صرف دوا سے نہیں دعا سے، پیار سے، سندر سو بھاؤ سے صحیح ہوتے ہیں۔''

''تو پھر آپ ہی ڈاکٹر کیوں نہیں بن جاتے.....'' دوسری عورت جو اس کی بھاوج تھی اس نے تلخ تیور میں اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ماں خاموشی سے سب سنتی رہی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد صرف اتنا بولی:

''بھیا! ہم تو اک دم سے تھک گئے ہیں، پہلے بھی بیمار ہوئی تھی مگر ایسی بیماری تو کبھی نہیں ہوئی تھی، لمبی تھکی ہوئی سانس کھینچتے ہوئے..... اس دفعہ تو اپنی زندگی سے ہی بیزار ہے۔ بس ایک ہی رٹ ہے..... اب سوچو نا بھلا ہمارے سماج میں ایسا ہوتا ہے کہیں..... ابھی تو ایک سال بھی پورے نہ ہوئے ہیں شادی کو..... یہ ہنسنے مسکرانے کی عمر، آہوں میں گزر رہی ہے.....'' ماں کی آنکھیں جل تھل ہو رہی تھی جنہیں وہ اپنے آنچل کے پلو میں چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی..... نوجوان نے موضوع بدلتے ہوئے دریافت کیا:

''اس کا پتی کہاں رہتا ہے.....؟ اس کو بھی تو آنا چاہئے تھا، ایسی حالت میں وہ تنہا چھوڑ کر کیا کر رہا ہے؟؟''

''نوکری کرتا ہے بیٹا!.....'' نوکری تو سبھی کرتے ہیں..... لڑکی اب چپ چاپ بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی اور بڑی معصوم نظروں سے اسے مستقل دیکھے جا رہی تھی..... ایک ایسی معصومیت جس پر فرشتوں کو بھی پیار آ جائے..... بھاوج

نے اسے گھورتے ہوئے کہا: نظریں نیچی کرو، تم کو شرم نہیں آتی ..... غیر مرد کو گھورتے ہوئے .....

لڑکی نظریں فوراً جھکا لیتی ہے ..... اسی لمحہ ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ سب سے پہلے ان ہی لوگوں کو کال کیا گیا۔ بند کمرے میں ایک کے بعد ایک سے علیحدہ کونسلنگ کی گئی، پھر سبھوں کو اکٹھا بلایا اور تھوڑی دیر میں وہ سب باہر نکل آئے .....

وہ انہیں گیٹ سے باہر جاتے ہوئے دور تک دیکھتا رہا اور بہت دیر تک سوچتا رہا:

''ہے بھگوان! اس یگ میں ایسے بھی دیوانے ہوتے ہیں .....؟''

ان لوگوں سے ملے ہوئے کئی ماہ بیت گئے تھے، اس کی یاد بھی ذہن کے پردے سے دھندلا گئی تھی کہ ایک صبح روزمرہ کی طرح اخبار دیکھتے ہوئے ایک سرخی پر اس کی نظر پڑ گئی۔ اخبار میں نیوز کے ساتھ ایک جوان لڑکی کی جلی ہوئی لاش بھی دکھائی گئی تھی مگر سب کچھ اس قدر مٹا مٹا سا تھا کہ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا:

''کیا یہ وہی لڑکی ہے یا دوسری .....؟'' افسوس ہم نے تو اس کا نام اور پتہ بھی نہیں معلوم کیا تھا .....''

گہری اداسی کے بعد اس کے دل نے پرزور آواز میں کہا: ''بھگوان نہ کرے وہ ہو ..... بیچاری معصوم بھولی بھالی لڑکی .....''

☆☆☆

دہشت گرد

''جواب دو! جواب دو؟'' انیس بیس سال کا سیدھا سادا نوجوان ایک ہی جملہ کو بار بار دہرا رہا تھا۔ اس کی معصوم آنکھوں میں آنسو کے قطرے چمک رہے تھے۔ گردونواح کے لوگ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یہ آخر کس سوال کا جواب چاہتا ہے۔ بغیر سوال کے جواب، ماجرا کیا ہے؟

بہت دیر کے بعد پتہ چلا کہ اس لڑکے کا ریزلٹ پنڈنگ ہے، وہ کسی انٹرویو میں جانا چاہ رہا تھا مگر نئی روز کی مسلسل بھاگ دوڑ کے بعد بھی رزلٹ اسے Incomplete ہی ملا تو وہ اپنے ہوش وحواس پر گرفت کھو چکا تھا اور بند گریل گیٹ کو پکڑے زور زور سے چلا رہا تھا۔

.....جواب دو!.....جواب دو! میرا جرم کیا ہے؟ میرا قصور کیا ہے؟؟

''سب کی طرح میں نے بھی امتحان دیا تھا، مگر ہمارا ریزلٹ ادھورا ہے..... آخر ہماری کاپی کہاں گم ہوگئی؟'' عنقریب تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر جاتا کسی نے پیچھے سے اسے سنبھال لیا۔

''.....میرے بھائی! اتنا ویاکل نہ بنو! دھیرج رکھو! دھیرج!! سب کام

ہو جائے گا۔"

"..... کیا خاک ہوگا؟ آٹھ دن سے دوڑتے دوڑتے بدحال ہو چکا ہوں، Urgent Result کے لئے تین گنی فیس جمع کر چکا ہوں، روز ٹال مٹول ہو رہا ہے۔

ٹھنڈی آہ کھینچتے ہوئے "آخر کب تک؟ کل تو مجھے انٹرویو میں جانا ہے"۔

اس نے سر کو گریل کے اندر گھسانے کی کوشش کی۔ جیوں ہی دربان نے گریل میں بند تالے میں کنجی ڈالی اچانک پیچھے سے دھکا دیتے ہوئے کئی لوگ اندر داخل ہونے کو ٹوٹ پڑے۔ وہ فرش پر اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ اس کے بغل میں دبی ہوئی فائل اس دھکم دھکی میں زمین پر گر گئی اور اس کے کاغذات ادھر ادھر بکھرنے لگے۔ وہ ذرا دیر بیٹھ کر انہیں ترتیب دینے کے بعد اندر (کنٹرول روم) پہنچ کر تیز آواز میں چلا رہا تھا:

"اگر میرا ریزلٹ آج نہیں ملا تو میں یہیں پر جان دے دوں گا۔ اس کی آواز کی گرمی نے سبھوں کو چونکا دیا تھا۔ ایک سیدھا سادا مسکین صورت لڑکا بھی اس قدر غیض و غضب کا حامل ہو سکتا ہے؟ حالات انسان کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں؟

اچانک وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے کہا:

"کیوں جی! تم دہشت گرد ہو؟ اس قدر غصہ کسے دکھا رہے ہو؟؟ ہم تمہارے باپ کے غلام نہیں! پھر قدرے بلند آواز میں "جو جی میں آئے کر لو، ہمیں پرواہ نہیں۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ فائل پر جھک چکا تھا۔ اس کی انگلیوں میں دبا

ہوا قلم تیزی سے حرکت میں آ چکا تھا، لیکن چہرے پر مستقل تناؤ بنا ہوا تھا۔

دھمکی کی آواز سن کر نوجوان جو کچھ دیر قبل جان دینے کی دھمکی دے رہا تھا اب جان لینے پر آمادہ نظر آنے لگا۔ اس نے بڑھ کر پاس رکھی کرسی اٹھا کر پھینک دی، عنقریب تھا کہ وہ ان کے کالر پکڑ لیتا کہ وہاں پر بیٹھے تمام افراد کھڑے ہو گئے اور اس لڑکے پر ٹوٹ پڑے:

''سالے تمہاری یہ ہمت؟ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ ایک تمہیں انٹرویو دینے جا رہے ہو؟؟ یہاں تو ہر روز ایسے ایسے پنڈنگ ریزلٹ کی بھرمار ہوتی ہے۔ جاؤ، جاؤ گھر جاؤ..... ریزلٹ ویزلٹ ملنے کو نہیں.....''

دوسرے نے کہا: ''بڑا ہیرو بنتا ہے سالا! دیکھیں کیا بگاڑ لیتا ہے ہمارا؟ بیٹھئے سر! ابھی پولس کو بلاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر واقعی وہ اٹھ کر ایک کونے میں جا کر موبائل کو سوئچ آن کر کے کسی سے محوِ گفتگو ہو گیا تھا۔

کچھ ہی وقفہ میں وہاں پر پولس آ گئی اور وہ سیدھا سادا نوجوان جو انٹرویو دینے جا رہا تھا جیل خانے کی سلاخوں میں بند کر دیا گیا۔ وہ چیختا رہا، اپنا درد سناتا رہا، مگر یہاں تو اسے دہشت گرد ہی قرار دے دیا گیا تھا، وہ بھی ایسا دہشت گرد جو منٹوں میں چور، قاتل، ڈاکو، لٹیرے ہر قسم کے خطاب سے نوازا جا چکا تھا۔ گریل گیٹ سے گھسیٹ کر جب پولس اسے باہر لے جا رہی تھی تو دربان کی آنکھوں میں آنسو کے دو قطرے آ گئے تھے، کیوں کہ وہ اچھی طرح جان رہا تھا کہ یہ سیدھا سادا ہونق بنا نوجوان سب کچھ ہو سکتا ہے مگر دہشت گرد نہیں۔ وہ بلا ناغہ ایک ہفتہ سے اسے اسی

طرح، اسی جگہ گڑگڑاتے ہوئے، آرزو منتیں، خوشامدیں کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ ٹھہرا ایک معمولی آدمی ---- اور ایک معمولی آدمی کی بات کو بھلا کون وزن دے گا۔ اس زمانے میں، جہاں ہر طرف آدمیت اور انسانیت کے قاتل، عقاب بنے آزاد فضاؤں میں مستقل اڑان بھر رہے ہیں، اس منظر کو دیکھ کر اس کے جسم میں کپکپی پیدا ہو گئی تھی اور اس کے لب دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے: ''اے کاش، کوئی ان کے پر کاٹ سکتا ---- اے کاش.....!!''

☆☆☆

مہورت

اس نے گھڑی دیکھا..... دروازے پر بیٹھے بیٹھے اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اس نے سوچا:

''یہ کیسا زمانہ آ گیا ہے؟ پہلے زمانے میں لڑکے والے لڑکی والے کے یہاں منسوب بھیجتے تھے۔ لڑکی کی طرف سے منسوب بھیجنا معیوب سمجھا جاتا تھا.....''۔

اچانک بجلی آ گئی اور سلینگ فین (Fan) ایک عجیب سی کھڑ کھڑاہٹ کی آواز کے ساتھ سر پر ناچنے لگا۔ دوپہر کی گرم ہوا وہ بھی عین سر کے اوپر، اسے کچھ اور نڈھال بنا چکی تھی .....اس نے بُور ہوتے ہوئے اپنی جیب سے وہ تصویر نکالی اور غور سے دیکھنے لگا۔

''کتنا ترشا ہوا نک سک ہے مگر قسمت..... واہ رے مولیٰ! قسمت بھی تو نے کیا دی ہے..... مناسب رشتے کی تلاش میں باپ کی کئی چپلیں ٹوٹ چکی ہیں مگر وَر ہے کہ ملتا ہی نہیں ہے''۔ پھر دل نے سرگوشی کی۔

''کہیں خود اپنا باپ بھی اس طرح بیٹی کا سودا کرنے نکلتا ہے''؟ پہلے دن تو وہ بے حد شرمسار تھا کہ کس طرح اپنی دختر عزیز کی فوٹو کو سر بازار نچائے گا مگر جب عمر بڑھنے لگی اور دوسروں پر بھروسہ اٹھنے لگا تو پھر مجبور ہو کر اس کام کے لیے خود کو آمادہ کیا۔ ادھر ملازمت سے بھی فرصت مل چکی تھی، ذہن بس ایک ہی محور پر گھوم رہا تھا۔ جتنا جلد

ہو سکے اپنے فرائض انجام دے لوں، نہ جانے کب موت کا بلاوا آ جائے۔ اس عمر میں کہیں آنا جانا بھی کس قدر دشوار ہے..... اکثر جگہوں پر تو بے حیا بن کر خود لڑکی کو ساتھ لے کر بھی اسے جانا پڑا تھا اور ایسے موقعوں پر سوال و جواب کی بوچھار سے اس کی گردن ایسی جھک جاتی کہ معلوم ہوتا اب وہ سیتا کی طرح زمین کے چاک ہونے کا انتظار کر رہا ہے.....۔

''.....زمین پھٹ کیوں نہیں جاتی.....''۔ ایک دن وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا۔

''زمین ابھی کیوں پھٹے گی؟'' بیوی نے خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''واہ جی! اتنا جلد تھک گئے..... ابھی تو..... سلسلہ شروع ہی ہوا ہے''۔ اس نے غور کیا واقعی ابھی تو.....

ایک کے بعد ایک متواتر تین بچیاں، پھر سب سے آخر میں ایک بیٹا۔ ساری امیدوں کا مرکز..... بوڑھی نگاہوں کا نور..... مگر اب تو کہتے ہیں کہ لڑکا لڑکی میں کوئی فرق نہیں..... پھر یہ دقیانوسی تصور کیسا؟

''.....ربابِ وقت کی راگنی بدل چکی ہے اور میں ہوں کہ ایک ہی راہ پر چل رہا ہوں.....''

ہم جھوٹے سپنوں میں کب تک جیتے رہیں گے؟..... وقت کی راگنی کہاں بدلی ہے؟ ہم تو پہلے کے مقابلے میں اور بھی تنگ نظر ہوتے جا رہے ہیں..... اگلے زمانے کے لوگ قول اور فعل کے پکے ہوتے تھے۔ اپنے پرایوں کا درد

محسوس کرتے تھے۔ ان کے کچھ اصول وقواعد تھے کچھ اخلاقی پابندیاں تھیں مگر آج کا آدمی تو ایکدم سے بزنس مین بن گیا ہے..... شادی بیاہ بھی ایک دھندہ بن گیا ہے..... جو اکسپرٹ ہیں اس دھندے میں انہیں آسانی سے کامیابی مل جاتی ہے مگر ایک اناڑی تو سات چکر لگا کر بھی ناکام کا ناکام.....

دروازے کا پردا ہلا اور اندر سے ایک مہین سی آواز آئی:

''آپ! باہر کیوں بیٹھے ہیں؟ دھوپ گرم ہو رہی ہے اندر تشریف لے آیئے .....'' وہ سلام وعلیکم کرتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کر پردا سرکاتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا ..... بڑا سا ہال نما کمرہ ہر طرف ریشمی سبز رنگ کے پردے پنکھے کی ہوا میں لہرا رہے تھے اور ایک خوشگوار فضا بنائے ہوئے تھے۔ وسط میں سرخ قالین پر شیشے کا خوبصورت ٹیبل دھرا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف بیحد خوبصورت ڈیزائن کے صوفے لگے ہوئے تھے، سادگی میں بھی شوخی کا رنگ رچا ہوا تھا مگر کمرہ تو بالکل خالی تھا، کوئی میزبان یہاں نہیں تھا۔ اب ادھیڑ عمر کی عورت پردے کے پیچھے سے فرما رہی تھیں۔

''آپ کو یہاں کس نے آنے کی دعوت دی تھی؟'' قدرے رک کر۔ ''برا نہیں مانیے گا..... میں صرف واقفیت کے لیے پوچھ رہی ہوں.....''

''نہیں نہیں اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے.....'' اس نے اپنی آواز کو بے قابو ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ پھر تھوڑا سنبھل کر گویا ہوا:

''محترمہ! یہ عابدین صاحب ہی کا گھر ہے نا؟ کہیں میں غلط مقام پر تو نہیں آ گیا؟؟'' اسے اپنے آپ پر بھروسہ نہیں رہا تھا۔ مشکل دوڑ دھوپ نے اس کی ساری

سوجھ بوجھ کو دھندلا دیا تھا۔

''..... ہاں ہے تو یہ عابدین صاحب کا ہی گھر..... مگر اس وقت وہ.....''

قدرے توقف کے بعد۔

''دراصل آپ کو فون کر کے آنا چاہیے تھا؟.....''

''فون کیا تھا محترمہ! مگر ادھر سے کوئی جواب ہی نہیں ملا۔ رینگ (Ring) مستقل ہوتی رہی۔ ممکن ہے آپ کا فون خراب ہو.....''

''ممکن ہے''، محترمہ کی آواز بیحد سرد تھی، ''کہیے کیا کام ہے؟''.....

''.....عابدین صاحب کے صاحبزادے دبئی میں ہیں؟ آپ تو غالباً ان کی اہلیہ.....؟'' جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اندر سے جواب آیا۔

''ہاں! میں عابدین صاحب کی اہلیہ ہوں، صاحبزادے ہیں تو.....''

''.....عابدین صاحب نے پیپر میں اشتہار دیا ہے کہ انہیں ایک اچھی لڑکی کی تلاش ہے۔ اوپر میں ارجنٹ بھی لکھا ہوا تھا''۔

''ممکن ہے''، دوسری طرف سے اکتائی ہوئی آواز آئی تو اس نے سوال کیا:

''عابدین صاحب خود کہاں ہیں.....؟ میں نے دو دن قبل ان سے بات کی ہے محترمہ!''

''میں نے کہا نا وہ اس وقت گھر میں نہیں ہیں، آپ کو فون کر کے، وقت لے کر آنا چاہیے تھا.....''

اب وہ کیا جواب دے کہ اس نے تو وقت لیا بھی، انہوں نے وعدہ بھی کیا

تھا۔ ٹائم بھی دیا تھا (اگرچہ یہ دو روز قبل کی بات تھی) مگر آخر وہ اتنی اہم بات بھول کیوں گئے۔ وہ ابھی خاموش ہی تھا کہ اندر سے آواز آئی:

''..... مجھے افسوس ہے کہ آپ کو خواہ مخواہ کی پریشانی ہوئی۔ عابدین صاحب کے صاحبزادے کی منسوب تو گھر میں ہی بالکل طے ہے۔ اگلے ماہ انشاءاللہ شادی بھی ہے.....''۔

اس نے جیب سے نکالی ہوئی تصویر کو دوبارہ مایوسی سے جیب میں ڈال لیا اور اپنی بچی کی تصویر کو کوستا ہوا زیرِ لب بولا:

''اگر ایسا تھا تو ان کو میرج بیورو سے اشتہار ہٹا لینا چاہیے تھا.....''

''ہاں! یہ تو آپ ٹھیک فرما رہے ہیں..... دراصل خیال ہی نہیں رہا''۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ آج کے لوگوں کو ان چھوٹی چھوٹی اخلاقی باتوں کا خیال ہی کب رہتا ہے .....؟

باہر نکلتے ہوئے ایک بات اور اس کے ذہن میں گونج رہی تھی کہ اس عورت کی باتوں میں کہاں تک سچائی ہے.....؟ ممکن ہے کہ میرے حلیے نے پہلے ہی انہیں بددل کر دیا ہو، پھر اسے خیال آیا کہ اگلے زمانے کے لوگ کہا کرتے تھے کہ ایسی باتوں کو کرنے کے لیے وقت اور مہورت بھی ایک ضروری شرط ہے۔ اس نے اپنی عجلت میں سارا کھیل ہی بگاڑ دیا..... کاش! وہ عرض مدعا سے پہلے عابدین صاحب کے آنے کا تو انتظار کرتا..... مگر اب تو، اب تو.....!

☆☆☆

فریج کی عورت

میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تھا تو مجھے ذرا بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ عورت اندر سے اس قدر دکھی بھی ہو سکتی ہے، وہ تو ایک دم سے فریج میں رکھی ہوئی سبزی یا پھل کی طرح تر و تازہ تھی۔ فاسٹی رنگ میں سیاہ باؤڈر کی ساڑی اور تنگ بلوز میں اس کا بھرا بھرا قدرے گداز جسم ایک عجیب سی کشش کا حامل تھا، بیضوی چہرہ، موٹے ہونٹ اور گہری گہری جھیل جیسی آنکھیں۔ کہتے ہیں کہ شخصیت کے تمام رموز اُس کی آنکھوں سے عیاں ہوتے ہیں مگر اس روز تو اس کی آنکھیں بھی مجھے دھوکا دے گئیں۔ شاید یہ پہلی ملاقات کا اثر تھا۔

میں آفیشیل ٹور کے سلسلہ میں اُس اجنبی شہر میں گیا تھا، شام کے سات بجے اُس کے گھر پہنچا۔ اُس کا چھوٹا بھائی اُسی دفتر میں کام کرتا تھا جہاں میں ٹور کے سلسلہ میں پہنچا ہوا تھا، ذرا دیر کی جان پہچان کے بعد وہ بضد ہو گیا کہ:

"چلئے سر! رات کا کھانا ہم لوگ ساتھ گھر میں ہی کھائیں گے، ان دنوں شہر کی فضا مرطوب ہے لہذا گھر کا کھانا صحت بخش رہے گا"۔ کچھ سوچ کر ذرا دیر بعد میں بھی راضی ہو گیا۔ گھر میں داخل ہوا تو ایک بوڑھی ماں اور دو چھوٹے بچوں کے ساتھ

اُسے بھی دیکھا تھا جو بالکل فرنچ کی عورت معلوم ہو رہی تھی۔ بھائی نے مسکراتے ہوئے تعارف کرایا تھا: ''یہ میری بہن ہے۔ چند سالوں سے ہمارے پاس ہی ہے''۔

''تو گویا معاملہ کچھ بگڑا ہوا ہے، ورنہ اس عمر میں بھائی اور ماں کے ساتھ کیوں رہتی.....؟''

ایک ادھ کھلی کتاب کی طرح وہ ہمارے ذوق تجسس کو بڑھاوا دینے لگی، مگر پہلی ملاقات ہی میں بہت کچھ جاننا، سمجھنا اور پوچھنا بھی تو مناسب نہیں تھا۔ وہ بھی ذرا دیر کے لئے ہی ہمارے سامنے آئی تھی اور وہ جو کہتے ہیں نا کہ جب تک گفتگو نہ کی جاتی ہے آدمی کے عیب و ہنر سامنے نہیں آتے۔ کھانا کھانے کے بعد کافی کی ایک کپ لینے کے بعد میں نے گھڑی پر نظر ڈالی تو دس بج رہے تھے، ہڑبڑا کر میں وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور چلتے چلتے صرف اتنا کہہ گیا کہ ''آپ سبھوں کی یادیں بہت دیر تک مجھے گرماتی رہیں گی، شکریہ! اس خاص میزبانی کے لئے''۔ میری توجہ اسی کی طرف تھی، اس نے پلکیں اوپر اٹھائیں، مگر زبان خاموش تھی۔ البتہ بھائی نے ہنس کر کہا تھا۔

''رات ٹھنڈی ہو چکی ہے، چلئے سر! میں آپ کو آپ کے ہوٹل تک چھوڑ آؤں''۔

''No thanks!.....فارمیلٹی مجھے پسند نہیں ہے''۔

''یہ فارمیلٹی نہیں، ضرورت ہے، رات میں آپ راستہ بھول بھی تو سکتے ہیں؟''

''تو کیا ہوگا کچھ دیر کی پریشانی کے بعد راستہ پا ہی لوں گا''۔

''بیٹا! انہیں تم ہوٹل تک پہنچا دو، مہمان کو کوئی دقت نہیں ہونی چاہئے''۔

ماں نے اصرار کیا تھا مگر وہ چپ چاپ کھڑی رہی! بہت مغرور معلوم ہوتی ہے۔ میں نے ایک پل کو سوچا! پھر ''گڈ بائی'' کہتے ہوئے سڑک پر ہم دونوں نکل آئے تھے، مگر میرے ذہن پر ایک لطیف ارتعاش تھا، اس کے بھائی کے بلاوجہ کے اس اخلاق پر، ماں کے اخلاص پر اور اس عورت کے پر اعتماد رویے پر۔

دوسری صبح ہی میں اُس شہر سے لوٹ چکا تھا مگر کبھی کبھی خواہش ہوتی کہ پھر کسی ٹور کے بہانے ہی وہاں جا پہنچوں اور اس اَدھ کھلی کتاب کو ذرا توجہ سے پڑھوں۔

شاید اسی خیال نے تقریباً دو سال بعد مجھے دوبارہ اس شہر میں Deputation پر چند ماہ کے لئے پہنچا دیا تھا، لیکن اس دفعہ اس کا بھائی آفس میں نہیں ملا اور میں سخت پریشان تھا کہ اب کیا کروں؟ رابطے کا پل ہی تو غائب ہو چکا ہے۔ اچانک اس کے گھر پہنچنا کیسا لگے گا۔ پتہ نہیں وہ لوگ بھی قیام پذیر ہوں یا.....؟''

کئی دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گئے۔ ایک شام بغیر کسی ارادہ کے قدم اس کے گھر کی سمت بڑھنے لگے شام کے چھ بج رہے ہوں گے، مٹیالے اندھیرے میں دروازے پر ہولے ہولے میں دستک دے رہا تھا۔ ذرا دیر بعد اچانک دروازہ کھلا اور وہی عورت سامنے کھڑی تھی۔ اس بار وہ زرد رنگ میں بالکل ہار سنگھار کا پھول معلوم ہو رہی تھی، کھلے بال شانے پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے جلدی سے پیچھے مڑنے کی کوشش کی۔ پھر آگے بڑھی اور دھیرے سے بولی: ''بھیا تو یہاں نہیں ہیں..... وہ تو اب پردیس میں رہتے ہیں''۔

''تو.....تو آپ اکیلی ہیں.....؟''

''نہیں ماں جی اور بچے ہمارے''

''کون ہے ری!'' کہتے ہوئے ماں لاٹھی کے سہارے سامنے آ گئی تھیں اور اپنی چندھیائی آنکھوں کو پھاڑ پھاڑ کو مجھے دیکھتے ہوئے حیرت سے چلا اٹھیں:

''تم.....تم ہو مہمان جی! ارے اندر تو آؤ بیٹا!'' ان کی آواز میں بے پناہ خلوص کے ساتھ کپکپاہٹ تھی۔

میں ماں کو سلام کرتا ہوا اندر داخل ہو کر ایک کونے میں بیٹھ گیا تھا۔ اس روز بھی رسمی گفتگو رہی اور ایک گلاس شربت پی کر میں فوراً باہر آ گیا تھا مگر کئی روز گزر جانے کے بعد دل نے پھر اسی کوچے کی سیر پر مجبور کیا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ کون سی کشش مجھے خراماں خراماں وہاں لے جاتی ہے۔ وہ ماں بیٹی بہت ریزرو ہو کر بھی ہمارے قریب آتی جا رہی تھیں، خاص کر بچے مجھے دیکھ کر ہی چلانے لگے: ''مما آ گئے ہیں، اب ہم مما کو جانے نہیں دیں گے..... ماں! تم بھی روکو نا!'' اور میں محسوس کرتا کہ یہ فریج کی عورت واقعی احساس کے معاملے میں بھی فریج کی ہی عورت ہے۔ ایسی برف صفت مزاج کی عورت کو تو میں نے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ شاید وہ ضرورت سے زیادہ اپنے اوپر لبادہ اوڑھنے کی عادی تھی، اس کی یہی عادت مجھے ناگوار بھی لگتی اور خوشگوار بھی۔ بہر حال ایک عجیب و غریب کشش تو ہے اس کی شخصیت میں۔

''شاید! عورت کو خود کو ایک معمہ کہلانے میں اچھا لگتا ہے''۔ میں نے ایک بار اسے چھیڑا تھا مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا یہ مختصر سا جملہ اسے اندر تک ٹھیس

پہنچا دے گا، وہ واقعی بری طرح مجروح ہوئی اور اس کی جھیل جیسی آنکھیں صحیح معنی میں جھیل کا نظارہ پیش کرنے لگی تھیں۔

''ارے! آپ تو برا مان گئیں۔ میں نے تو بس یوں ہی آپ کو چھیڑا تھا.....''

''آپ نہیں جانتے کہ عورت چھیڑنے کی چیز نہیں ہوتی، آپ کی طرح وہ بھی ایک زندہ مخلوق ہے''۔ جملے کی انی براہ راست میرے دل کو گھائل کرتی چلی گئی۔

میں اب واقعی پچھتا رہا تھا، یہ کس بلا کو میں نے دعوت دے دی، کچھ دیر تک صبر آزما لمحے سے گزرنے کے بعد میں نے التجا کی: ''اچھا بھائی! مجھے معاف کرو.....''۔ وہ جھٹ سے بولی: ''آپ مرد اسی طرح معافی مانگ کر بڑے بڑے گناہ کر جاتے ہیں اور ہم بیچاری عورتیں اس گناہ کا کفارہ ساری عمر ادا کرتی رہ جاتی ہیں''۔ آج وہ بڑی مشکل سے کھلی تھی۔ لاشعوری طور پر کہتی جا رہی تھی: ''آپ جانتے ہیں؟'' میں سراپا جستجو بس اسے دیکھے جا رہا تھا، وہ کہے جا رہی تھی۔

''آج سے پندرہ سال قبل میری زندگی میں کوئی آیا تھا۔ یہ دو کھلونے دے کر وہ بدیس چلا گیا۔ شروع میں اس کے خطوط آتے رہے، گاہے گاہے پیسے بھی بھیجتا رہا، مگر اب تو.....اب تو.....''

وہ پھر ساون بھادوں کی طرح برس پڑی۔ میں نے تسلی دیتے ہوئے سمجھایا: ''وہ آپ کو بھولا نہیں ہوگا، یقین مانئے! اس کی کوئی مجبوری ہوگی.....''

''ہاں! اسی یقین پر تو زندہ ہوں..... اور اب تو میری زندگی بہت آگے بڑھ چکی ہے..... اب تو ان بچوں کی فکر دامن گیر ہے''۔

میں نے پہلو بدلتے ہوئے سوچا: ''کیا ایک عورت کی زندگی اتنی مختصر ہوتی ہے، بس کلی کا پھول بن جانا۔ ہنھ..... یہ کیا زندگی ہوئی''۔

میں نے پرزور لہجے میں کہا: ''آپ بھی خوب کہتی ہیں..... ابھی تو آپ کو بہت کچھ کرنا ہے، ان ننھے بچوں کی خاطر ایک لمبی عمر پانا ہے..... آپ کو..... آپ کو''۔ آگے پتہ نہیں کیوں میں کچھ بول نہیں سکا، آواز میری حلق میں اٹک گئی۔ یہ فیصلے کی گھڑی تھی بھی نہیں۔ پھر مجھے کیا حق، ایک اجنبی عورت کی زندگی میں دخل اندازی کرنے کا، میں نے اپنے کو سختی سے روک لیا اور دل میں اُٹھتے ہوئے جذبات پر پردہ ڈالتے ہوئے کہا:

''..... آپ ان بچوں کی تعلیم کے لئے کیا کر رہی ہیں؟''

''کیا کروں گی، تنہائی اور ویرانی میں کچھ سوجھتا بھی کہاں ہے؟'' اس نے ٹھنڈی آہیں کھینچیں:

''سارا جھگڑا تو ذریعہ معاش کا ہی ہے.....''

پھر کچھ وقفے تک خاموش رہنے کے بعد بولی:

''میرے خاوند نے بھی بے وفائی دکھائی تو شاید اس کے پیچھے بھی یہی بڑھتا ہوا روز روز کا خرچ تھا، ہم جب تک دو تھے تو سب کچھ آسان تھا مگر دو سے چار ہونے پر، ہم کس طرح بکھر گئے۔ مانو یہ ہمارے بچے نہیں کوئی باہر سے لائے

ہوئے بچے ہوں۔ وہ بات بات پر جھڑکتا تھا۔ اپنی آزادی کو پابندی میں بدلتے دیکھ کر اس کی تلملاہٹ بڑھتی گئی۔ وہ کہتا: ''اب تم کچھ کرو''۔ مگر ہماری مجبوری یہ تھی کہ میں گھر کے کام کاج میں تو ہاتھ بٹا سکتی تھی، لیکن اس کی خواہش کے مطابق پیسہ کمانے والی مشین نہیں بن سکی۔ پاپا بھی نہیں تھے جو اس کی فرمائش کو پوری کر سکتے''۔

نم آنکھوں سے اس نے آنگن میں سوتی ہوئی ماں کی طرف نظر دوڑائی جن کے خراٹے کی آواز اب یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ بڑھاپا بھی کیسی حقیقت ہے؟ میں نے لمحہ بھر کو محسوس کیا: واقعی اس عورت کے ساتھ دوہری مجبوری ہے، ایسے میں بھائی بھی پیسہ کمانے کی مشین بننے کے لئے باہر چلا گیا ہے..... میں نے اسے تسلی آمیز لہجہ میں کہا:

''کوئی ضروری نہیں کہ ہر عورت پیسہ کمانے والی مشین ہی بن جائے..... تمہارے خاوند کی سوچ غلط تھی.....''

''ممکن ہے.....'' اس کا لہجہ نہایت درد میں ڈوبا ہوا تھا:

''میں بالکل ان پڑھ ہوں بھیا! پڑھنے کی عمر میں جو نہ پڑھ سکے پھر ساری عمر اسے پچھتانا ہی پڑتا ہے''۔

''زیادہ غم نہ کیجئے..... اللہ بہتر سبیل پیدا کرنے والا ہے''۔

''سو تو ہے مگر آج وقت کے تقاضے تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں، ایک بڑے شہر میں عورت کے لئے مرد کے شانہ بہ شانہ کھڑا ہونا ضروری ہے..... آپ ہی

دیکھئے نا، بھائی کی شادی کے بعد بھابھی بھیا ایک ساتھ.....''

''دونوں ایک ساتھ بدیس چلے گئے ہیں؟''

''جی ہاں! دونوں ایک گاڑی کے دو متوازن پہیے ہیں۔ میری طرح گاڑی کے ایسے پہیے نہیں جن پر گاڑی کا وزن ہی سلامت نہ رہ سکا''۔ اس نے آنکھوں کے گیلے پن کو آنچل میں سمیٹ لینا چاہا تھا اور میں کہہ رہا تھا: ''آپ فضول باتیں بہت سوچتی ہیں، جو ہو گیا اسے بھول جائیے، تقدیر کے لکھے کو مٹایا نہیں جا سکتا ہے''۔

''آپ بھی آ گئے نا تقدیر پرستی پر.....''۔ وہ تھوڑا مسکرائی۔ بچے اسکول سے آ چکے تھے اور گھر کا ماحول شور شرابہ میں بدل چکا تھا۔ کئی گھنٹے کی لمبی گفتگو سے میں بھی مضمحل ہو چکا تھا۔ اس دن میں نے اس کے بچوں میں بھی کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔

ہوٹل پہنچ کر جب بستر پر دراز ہوا تو سوچ رہا تھا کس طرح جلد Deputation Period گزرے اور ہم اپنے وطن لوٹ جائیں۔ جہاں میرے بچے ہیں، میری بیوی ہے، میرا چھوٹا سا پر سکون گھر ہے۔ اس شہر سے واپسی کی گھڑی میں ایک خیال آیا تھا:

''کیا میں اس بے حد دکھی عورت کو چھوٹا سا سائبان دے سکتا ہوں.....؟ کیا میں اس سے کچھ وعدہ کر لوں.....؟''

''نہیں، شاید نہیں..... ہرگز نہیں، ہم اتنے دلدار نہیں بن سکتے کہ اپنا پر سکون گھر..... ہمارا معاشرہ بھی تو کچھ کہتا ہے، بن بیاہی لڑکی کی بات ہی کچھ اور ہے مگر ایک

شادی شدہ دو بچوں کی ماں.....؟؟"

گاڑی تیز رفتار سے سیٹی بجاتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی اور میں Deputation Period کے ان لمحات کو واقعی عارضی محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆☆☆

سفر زندگی کا

ٹرین پوری رفتار سے آگے بڑھتی جا رہی تھی اور اسے لگ رہا تھا جیسے سب کچھ پیچھے چھوٹتا جا رہا ہے۔ زندگی کا یہ سفر کیسا عجیب ہے، انسان کبھی کبھی حالات کے ہاتھوں کیسا بے بس ہو جاتا ہے۔ اتنی لمبی عمر میں اس نے کبھی تنہا سفر نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ اُس کا ساتھ تھا، شاید اسی لئے آج اسے بیتے لمحے بہت شدت سے یاد آ رہے تھے۔

اس شہر میں اسے لگ بھگ بیس سال بیت چکے تھے۔ جب وہ پہلی بار یہاں آیا تھا تو کیسا بھرپور تھا، کتنی چاہت ملی تھی اسے اس دیار میں، اس کی خوش اخلاقی نے سبھوں کو متاثر کر لیا تھا اور بہت جلد اس نے اس اجنبی شہر کو اپنا بنا لیا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی اس طرح وہ.....

ہاں یہ سب تو کچھ عجیب سا ہو گیا ہے اس کے ساتھ۔ اس عمر میں بھلا ترکِ وطن کیسے گوارہ کیا جا سکتا ہے آسانی کے ساتھ۔ وہ بھی اس قدر طویل سفر اکیلے۔ چلتی ٹرین کی کھڑکی سے اس نے شام کے بڑھتے سائے پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی، امیر خسرو کا ایک مصرع اس کے ذہن میں گونجنے لگا ع

چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چو دیس

مگر اب اس کا گھر کہاں؟ گھر تو..... اس کی پلکوں پر آنسو چھلک آئے تھے جنہیں اس نے بڑے سلیقے سے اپنی جیب سے رومال نکال کر صاف کیا۔ دھندلائے ہوئے منظر روشن ہو گئے۔

''مری جان! آپ کیا سوچ رہی ہیں؟ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ.....''

جواب میں تقریباً نقرئی سی گھنٹی بج گئی تھی، شرم سے گلنار چہرہ کس قدر پُر بہار تھا اس وقت..... مانو تازہ سے تازہ سیب اپنی پوری چمک اور سرخی کے ساتھ خوبصورت تھال میں آپ کے سامنے رکھ دیا گیا ہو۔ یا سرخ گلاب اپنی پوری سرخی کے ساتھ اچانک کھل اٹھا ہو۔

''نہیں! نہیں! میں تو کچھ بھی نہیں سوچ رہی ہوں''۔ وہ صاف جھوٹ بول رہی تھی مگر اس جھوٹ میں بھی کیسی دلکشی تھی۔ پھر ذرا دیر کی خاموشی کے بعد سریلے لہجے میں بولی: ''راجن میں سوچ رہی ہوں کہ زندگی کے اس سفر میں ہم لوگ کامیاب رہیں گے یا.....؟'' اس کی آنکھوں میں فکر مندی جھلک رہی تھی۔

''تم ابھی بھی شک میں ہی ہو؟ جیون ساتھی اگر خوبصورت ہونے کے ساتھ وفادار بھی ہو تو..... تو پھر اسی دنیا میں جنت ہے..... کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ ہم دونوں بڑے اچھے جیون ساتھی ہیں، ہماری شادی پریم ویواہ ہے، اسے تو کامیاب ہونا ہی ہے.....'' اس نے بڑھ کر اسے چوم لینا چاہا تھا مگر آس پاس تاکتی نگاہوں نے اسے ایسا کرنے سے روک لیا تھا۔

''میں تو تمہارے اصرار کے باوجود انکار ہی کر رہی تھی مگر پاپا نے تمہیں دیکھنے کے بعد یقین دلایا کہ لڑکا ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور full of ambitions ہے، جلدی ہی اچھی نوکری مل جائے گی اماں بھی راضی ہو گئیں اور سارے اختلاف بھول گئیں''۔

''ہاں! میرے گھر والے بھی تو تمہیں بے حد پسند کرنے لگے۔ شروع میں تو ایسا لگا تھا کہ تمہیں پانا میرے بس کی بات نہیں ہے، مگر جب پیار سچا ہو تو.....''

''واقعی! میں خود کو دنیا کی سب سے خوش نصیب عورت سمجھتی ہوں۔ پیار کا جواب جب پیار سے مل جائے تو پھر ساری کائنات مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے''۔ عورت نے مسکراتی ہوئی نظروں سے مرد کی جانب دیکھا تھا۔

فوراً اسکرین بدل گیا، تصویریں آڑی ترچھی ہونے لگیں۔ ایک خوشحال پریوار اچانک..... نہیں اچانک نہیں، کچھ سالوں بعد زندگی کا سفر بوجھل بنتا چلا گیا۔ کسی نے کہا: ''دیکھ لیا نا پریم ویواہ کا انجام.....؟''

اس نے سوچا: ''شاید بھول مجھ سے ہی ہو گئی، میں کچھ عجلت باز اور نا مصلحت اندیش بھی رہا ہوں۔ عورت اور مرد کے رشتے میں اگر ذرا سا بھی بال پڑ جائے تو پھر شیشۂ دل کے ٹوٹنے کا خطرہ تو بن ہی جاتا ہے''۔

ایک شام جب وہ باہر سے آئی تھی خوبصورت پرس اس کے ہاتھ میں جھول رہا تھا جسے آتے ہی تلملاتے ہوئے اس نے سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر پھینک دیا تھا اور خود کچن میں چائے بنانے چلی گئی تھی۔ اچانک موبائل کی گھنٹی بجنے لگی، اس نے اٹھ کر

اس کے پرس سے موبائل نکالنا چاہا، وہ کچن سے دوڑی اور موبائل تیزی سے اس کے ہاتھ سے لپک لیا، گھنٹی بند ہوگئی لیکن اس کی یہ ادا نہ جانے کیوں اس کے دل کو گھائل کر گئی۔ وہ بہت دیر تک اس خیال میں ڈوبا رہا کہ ''کیا رشمی مجھ سے کچھ چھپا رہی ہے .....؟'' وہ چائے لے کر آئی تو بھی اسے لگا کہ اس کی اداؤں میں اب وہ پہلا سا والہانہ پن نہیں ہے۔ یہ شک کا پہلا بیج تھا جس کی کونپلیں بہت تیزی سے بڑھتی گئیں وہ اپنے اندر درد کا ایک عجیب احساس محسوس کرنے لگا تھا۔ ایک دو بار اور ایسا ہی عمل ہوا تو اس کی بے چینی بڑھتی چلی گئی، زباں سے کچھ کہنے کی بجائے اس کی خاموشی گہری ہوتی چلی گئی، وہم مضبوط ہوتا گیا کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟ شک کے بڑھتے ہوئے اس زہریلے کیکٹس نے گھر کی فضا کو مسموم بنا دیا تھا۔ وہ خوشی، وہ سکون وہ راحت جو چند ماہ قبل زندگی کو جنت بنائے ہوئے تھی، اپنا رخ موڑ چکی تھی۔ یہ سب کچھ اتنے نامعلوم طریقے پر ہوا تھا کہ دونوں ہی حیران و پریشان تھے۔ افسوس کا مقام یہ بھی تھا کہ ان دونوں کے رشتے کی کوئی پہچان اب تک سامنے نہیں آئی تھی۔ اس نے اپنی اس چاہت کا اظہار بھی کیا تو بڑا تلخ جواب سننے کو ملا: ''کالج کی اس Adhoc ملازمت میں بڑے لمبے لمبے خواب دیکھ رہے ہیں حضور، اپنا فیوچر تو برباد ہوا ہی.....'' پھر ٹھنڈی آہ کھینچتے ہوئے ''اس قدر قلیل آمدنی میں تو ہم دو بھی اچھی طرح نہیں جی پا رہے ہیں تیسرا آئے گا تو خرچ بڑھے گا اور مجھے بھی کام چھوڑنا پڑے گا'' ذرا دیر کی بوجھل خاموشی کے بعد ''ان باتوں کو آپ سمجھتے کیوں نہیں! بار بار ایک ہی بات.....'' اس کے لہجے میں اس دن غضب کی جھنجھلاہٹ تھی، وہ حیران بت بنا سوچ رہا تھا کہ: ''آخر یہ

کیسی عورت ہے جو ماں جیسا مقدس رشتہ اپنانے سے بھی گریز کر رہی ہے.....؟'' اس کی فکر گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ''آج کی نسل کدھر جا رہی ہے؟ آزادیٔ نسواں کا یہ انجام؟ کیا یہ رشتہ ایک خوشگوار زندگی کا ضامن بن سکتا ہے؟؟'' وہ اس عقلیت پسندی کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور وہ اس کی جذباتیت پر مسلسل لعن طعن کر رہی تھی، باہر چاندنی مسکرا رہی تھی اور اندر کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، تمام رات تو تو میں میں، میں گزر گئی، ماحول بیحد حبس زدہ ہو کر رہ گیا۔ آخر کو ایک دن ..... ایک دن وہ ہو گیا جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ ماں بننے والی تھی اور جیسے ہی اس بات کا اسے علم ہوا، مزاج کی برہمی بڑھتی چلی گئی۔ ایک روز نہایت ترش رو ہو کر مخاطب ہوئی: ''آپ مرد! ہم عورتوں کو صرف اپنی کھیتی سمجھتے ہیں، اور بس.....''۔ ''اس میں بھی شک ہے کیا؟'' اس نے ہنس کر جواب دیا، واقعی وہ بے حد خوش تھا، اسے خوش دیکھ کر وہ اس قدر چراغ پا ہوئی کہ تھوڑی دیر تک تو وہ ہکا بکا بنا اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ ماں کا مقدس مقام پا لینے کے لئے وہ کسی طرح تیار نہیں تھی، اس کے اس رویے نے اسے شدید ذہنی کرب میں ڈال دیا تھا۔ وہ غور کرتا رہا۔ اسے اس کا ذہنی خبط کہا جائے یا موجودہ زمانے کی غلط آزادی اور فیشن کا مزاج؟ اس نوعیت کے سوالات اسے تمام رات پریشان کرتے رہے۔ وہ بھی مستقل کروٹیں بدلتی رہی۔ اس واقعہ کے بعد سے ایک ہی بستر پر دونوں اس طرح اجنبی بن گئے مانو کبھی ان کی زندگی میں پیار کا کوئی شیریں لمحہ آیا ہی نہ ہو۔ بارہا چاند دریچے سے اندر جھانکتا رہا، منظر بے حد رومانی اور اضطراری ہو جاتا مگر وہ ہمیشہ اکھڑی اکھڑی سی رہتی۔ اس نے منانا بھی چاہا تو بے رخی بڑھتی چلی گئی۔

ایک ڈھلتی ہوئی شام میں وہ کافی دیر سے گھر آئی، دوائیوں کی شیشی سنگار میز پر رکھتی ہوئی دھیرے سے بولی: ''میں نے فیصلہ کرلیا ہے راجن صاحب!'' اخبار پڑھنے میں وہ منہمک تھا، نظریں اٹھا کر پوچھا: ''کیا؟'' پھر اس نے اخبار کو لپیٹ کر ایک کنارے رکھ دیا۔ وہ ذرا دیر میں چائے کی پیالی لئے قریب آئی اور تپائی پر رکھتے ہوئے شکایتی لہجے میں بولی: ''میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم مجھے فوراً محبوبہ سے ماں بنادو گے؟'' تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ فوراً باورچی خانہ میں چلی گئی، دیر رات میں بستر پر آئی، صبح جب آنکھ کھلی تو اس کے سرہانے میں خالی شیشی پڑی ہوئی تھی، سامنے باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا جہاں وہ درد سے تڑپ رہی تھی، فوراً اسے لے کر وہ ہاسپٹل چلا گیا۔ ڈاکٹرنی نے معائنہ کے بعد کہا: ''افسوس بہت دیر ہوچکی ہے''۔ ڈاکٹرنی نے بھی دکھ کا اظہار کیا۔ صفائی کے بعد اسے گھر پہنچا کر وہ اپنے ہی گھر میں ایک اجنبی کی طرح رہنے لگا۔ اس ترقی یافتہ عہد کا یہ ایک ایسا المیہ تھا کہ کسی سے کچھ کہتے بھی نہ بنتا۔ تھوڑے عرصے بعد میڈیکل جانچ سے اسے ایک اور صدمہ ہاتھ لگا کہ اب وہ ماں بننے کا شرف ہمیشہ کے لئے کھو چکی ہے۔ اس نئی آگہی نے اسے زندہ در گور کردیا۔ ہر قسم کی دلچسپی سے الگ وہ مستقل بیمار رہنے لگی اور ایک روز وہ اس دنیا سے چلی ہی گئی اور وہ..... وہ جو اس کی یادوں کا دیوانہ بنا ہوا تھا اس شہر کو ہی خیر باد کہنے پر مجبور ہوگیا۔ مستقل ملازمت بھی نہیں تھی لہذا دور دیس میں والدین کے پاس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ زندگی تو کسی نہ کسی مقصد سے حسین ہے۔

ٹرین پوری رفتار کے ساتھ سیٹی بجاتی آگے بڑھتی جارہی تھی۔ رات کا

خوفناک منظر ہر نقش کو تاریکی میں ڈبو چکا تھا۔ گاڑی کی دھک دھک اس کے دل کی دھڑکن کو تیز کر رہی تھی۔ دریچے سے باہر نظر گئی تو دور آسمان پر چاند گہرے بادل میں چھپ چکا تھا۔ اس کی خواہش ہوئی: ''اے کاش! چاند چمکتا رہتا تو ایسا اندھیرا تو نہ ہوتا''۔ وہ اسی اگر مگر میں الجھا ہوا تھا کہ کسی کتاب میں پڑھی ہوئی عبارت جگنو کی طرح ذہن میں چمک پیدا کرنے لگی، اس نے پڑھا تھا کہ: ''زندگی صرف اپنے لئے نہیں ہوتی ہے۔ اصل زندگی تو دوسروں کے لئے جی جاتی ہے اور دنیا میں یادگار انسان بھی وہی ہے جس کی اپنی زندگی تاریک ہے''۔ تو گویا اس ناکام زندگی کو میں بھی یادگار بنا سکتا ہوں۔ ''یقیناً'' روح کی گہرائی سے ایک آواز آئی اور حافظؔ کا ایک مصرع عالم وجد میں اس کی زبان پر مچلنے لگا ع

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق

☆☆☆

غلط شرشک

ہے بھگوان! یہ کیسی رام کہانی ہے جس کا شرشک ہی غلط پڑ گیا ہے۔ اس نے بیحد اچیت ہوتے ہوئے سوچا ..... مگر اب ..... بھلا کیا ہوسکتا ہے جب شروعات ہی بھول سے ہوگئی ہو تو ..... واقعی اپنے جنم دن سے ہی ناری دوشی ہے۔

اے لڑکی! یہ سب تو کیا سوچ رہی ہے؟ بوڑھی دادی اماں نے اسے دلاسا دیا ..... ماں تو خموش غصے میں منہ پھولائے تھی مگر دادی اماں اس کے نزدیک آکر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

دادی اماں! اب کیا ہوگا .....؟ اس نے بھیگی پلکیں اوپر اٹھائیں تو ایسا لگا مانو ساغر چھلک رہے ہوں شراب کے ..... وہ واقعی اتنی حسین تھی نہیں مگر اس وقت اس کے حسن کا جوبن ہی کچھ اور تھا۔ شاید آدمی کے اندر کا جذبہ سب سے پہلے اس کی آنکھوں میں جھلک پڑتا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے شریر کے تمام رنگ اس رس میں ڈوب جاتے ہیں —— اس نے ۴۱ رس کے بارے میں کتابوں سے جانا تھا مگر دیکھا تھا ان میں صرف چند کو ہی .....

دادی اماں کچھ چھنوں تک بُت بنی اسے حیرت سے تکتی رہیں .....

چھوکری اتنی بھی من موہنی ہو سکتی ہے.....؟ بچپن میں کیسی کھٹاسن جیسی لگتی تھی کالی کلوٹی..... مگر جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی اس کا رنگ بھی کالا سے سانولا ہو گیا اور ایک خاص طرح کی جسمانی کشش اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ ابھی تو عمر یہی کچھ سولہ سترہ کی رہی ہوگی مگر غضب کی بہار آئی ہے اس چھوکری پر۔ دادی اماں نے قدرے تردد سے سوچا۔ غریبوں کی سندرتا بھی مصیبت ہی ہے یہ جانے کس کس کو بولائے گی.....؟ خود تو دن بھر بولائے پھرتی ہی ہے.....

بوڑھی دادی کو اس طرح اپنی اُور گھورتے دیکھ کر وہ شرم سے سر جھکا لیتی ہے۔

اور دھیرے سے پوچھتی ہے: دادی اماں، کیا آپ کو بھی ہمیں پر شک ہے؟ نہیں دادی! ہم نے کچھ نہیں کیا تھا..... ہچکیوں کے درمیان رات کے واقعے سے وہ پردا اٹھا رہی تھی ..... ساری شرارت آپ کے ..... مگر اسے تو کوئی کچھ کہتا نہیں ہے ..... سارا جمانہ ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے..... میں کس کس سے اپنا دکھ کہوں..... ذرا دیر کی خموشی کے بعد ..... کیا دادی اماں ..... مہان اور پوتر لوگوں کے گھر میں رہ کر بھی میں اپوتر ہی ہوں ..... آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں ..... میں گریب (غریب) ہوں نا جلیل (ذلیل) ہوں مگر جانور نہیں..... آپ لوگ تو ہمارے ساتھ پشوؤں جیسا وَیوہار کر رہی ہیں..... ہم کس سے اپنا دکھ بتائیں دادی اماں..... وہ پھر گھٹنے میں سر ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی مانو بادل پھٹ گیا ہو اور گھر کا سارا مان سمان اس سیلاب میں بہہ جانے کو ہے..... رُندھی ہوئی آواز میں وہ کہے جا رہی تھی۔

ماں جی بول رہی تھیں کہ وہ میرے بال کٹوا دینگی۔ میرے منہ پر تیجاب

(تیزاب) ڈلوادینگی، مجھے ننگا کر کے گھر سے ..... دادی! آپ انہیں سمجھایئے نا

..... ہمرا کسور کچھ بھی نہیں ہے ..... وہ دادی کے پاؤں پر جھک پڑی تھی۔

پروشتم بابو نے کہا تھا اگر تو ..... اگر تو ..... تو .....

دادی نے سر جھکا کر اسے اٹھالیا اور اشارے سے پوچھا کیا کہا تھا۔ یہی نا کہ

تو ..... تو ..... تو اس کے ساتھ ..... نہیں دادی اس نے کہا تھا ''میں تجھ سے بڑا پریم کرتا

ہوں ..... تیرے بنا ایک پل من نہیں لگتا۔ میں تجھ سے ویواہ رچاؤنگا''۔ پھر اس نے

میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی کوٹھری میں .....

تو ..... تو چلائی کیوں نہیں؟ ..... تو پورے گھر کو جگا دیتی ..... اتنا بڑا پاپ

اپنے کمزور چھاتی پر کیوں اٹھالی .....؟ بول بیٹی! بیاہ سے پہلے ..... یہ سب گھور پاپ

ہے نا ..... اور اگر تو ..... تو ..... ایک ان دیکھے خوف سے دادی اماں کانپ رہی تھیں

—— یہ دلت پریوار بھی صرف کہنے کو دلت ہے۔ ہماری گھرنا بھی صرف کچھ خاص

بندوؤں پر ہی ہے۔ ورنہ ..... ورنہ پروشتم ایسا کیوں کرتا ..... اس لمحے اسے گھن نہ آئی

..... ہے رام! سچ میں کہانی کی شروعات ہی غلط ڈھنگ سے ہوگئی ہے ..... اب کیا کیا

جائے؟ دادی سر پکڑ کر بیٹھ گئی ..... ماں الگ کمرے میں چادر تانے سونے کی نقل کرتی

ہوئی مون دھارن کیے ہوئی تھیں —— پروشتم کے پتا دور دیس میں اپنے کاروبار میں

لگے تھے۔ پیسے کی کمی نہیں تھی مگر گھر میں کلچر نہیں تھا۔ جب ہی تو کسی غریب کی عزت

منٹوں میں خاک میں مل گئی —— کیا ماں باپ اور سماج والے زبردستی اس کی گردن

میں یہ ڈھول نہیں باندھ سکتے جواب سماج میں سر اٹھا کر چلنے یوگ بھی نہیں رہی۔ بن

باپ ماں کی بچی کا یہ حشر! اب کون اس سے بیاہ رچائے گا؟

بہت سارے سوالات تھے جس کے گھیرے میں گھر کر دادی اداس ہو رہی تھیں۔ انہوں نے ہولے سے کہا: او چھوکری اب چپ ہو جا! جو ہونا تھا سو تو ہو گیا ..... اسی لیے تو تجھے سمجھاتی تھی ..... ذرا ڈھنگ سے رہ، مگر تو سنتی ہی کب تھی۔ ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر دادی بستر پر ڈھیر ہو گئیں —— روتے روتے وہ بھی وہیں زمین پر ان کے پائینتی میں سو گئی ..... مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ اتنی زور سے چیخی ..... مانو کوئی برا سپنا دیکھا ہو ..... سپنا کیا وہ تو حقیقت تھی جب اس پر بیتی تو وہ نہ چیخی نہ چلائی اور لمحہ گذر جانے کے بعد اس لمحہ کی یاد میں اس پر جنون کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ کبھی من کرتا پورے گھر میں آگ لگا کر خود بھی اسی آگ میں بھسم ہو جائے۔ کبھی پروشتم کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کی حسرت اسے ہوتی ..... کبھی سماج میں بیٹھ کر اپنا حق مانگنے کی تمنا، مگر وہ کرتو کچھ بھی نہیں پا رہی تھی۔ سوائے آنسو بہانے کے ..... مگر آنسو کب تک ..... کب تک اس کے درد پر چھڑکاؤ کریں گے وہ تو ہر پل آنے والے عذاب کے خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

اس کی رنگت دنوں دن پیلی پڑتی جا رہی تھی، آنکھوں کی چمک دھندلا رہی تھی۔ کیا غریب کی بیٹی کی یہی سزا ہے؟ ایک دن وہ دادی اماں سے آخر پوچھ ہی بیٹھی: دادی آخر ہم بھی تو ایک لڑکی ہی ہیں؟ کیا سماج ہمیں ہمارا جائج (جائز) حق نہیں دے سکتا؟

کیسا حق بیٹی؟ دادی نے ایکدم چونک کر پوچھا۔

وہی حق دادی اماں؟ جس کی دہائی دی تھی آپ کے پروشتم بابو نے.....اب وہ خاموش کیوں ہے؟ اس نے تو کہا تھا میں ایک جمانے (زمانے) سے لڑ سکتا ہوں تیرے لئے.....تو میری ہی رنجو۔ میں تجھ سے جلد ہی بیاہ رچالوں گا۔ پھر.....پھر.....کوئی کچھ نہیں کہے گا.....دوپٹے کے پلو کو اس نے کس کر پیٹ پر باندھ لیا تھا۔ وہ کچھ چھپانا چاہتی تھی جواب کسی طرح چھپنے میں نہیں آرہی تھی۔ دادی اماں کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ اب اس چھوکری کا کیا ہوگا.....کہیں دور بھی کون لے جائے.....بہورانی تو کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہیں.....پروشتم نظر ملاتے ہوئے بھی ڈرتا ہے۔ کہیں.....کہیں.....پاپ کا یہ پٹارہ میں اس کے سر پر نہ دے ماروں.....جڑی بوٹی اور دوا بھی جب کام نہ آئی تو ماں نے ایک روز غصے میں کہا۔ اے چکنا گھڑا! اب کیا ارادہ ہے تیرا؟.....وہ خاموش کھڑی رہی۔ وہ آگ اگلتی رہی۔ کل صبح ہونے سے پہلے تم کو جو کچھ لینا ہے لے لو.....مگر ہمارا گھر چھوڑ دو۔

سامنے پروشتم سر جھکائے بیٹھے تھے.....ایک نظر اس نے ان پر ڈالی تو وہ اور بھی سر کو جھکا لیے.....رات بھر اسے نیند نہیں آئی۔ خیال آیا پروشتم سے جا کر پوچھے کہ تم کیا سوچ رہے ہو اس بارے میں.....؟ مگر ہمت نہ پڑی۔

صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے ہی اماں نے اس کی چٹیا پکڑ کر دروازے سے باہر دھکیل کر کنڈی چڑھا دی.....وہ بہت دیر تک دروازے پر کھڑی روتی رہی مگر کسی میں بھی اتنی انسانیت نہیں تھی کہ اسے اندر بلا لے.....اسے حیرت تو اس بات کی تھی کہ پروشتم آخر کیسا مرد ہے کیا وہ اپنی ماں سے صرف اتنا نہیں بول سکتا تھا کہ ماں کم

سے کم اتنا دن تو اسے رہنے دو اس گھر میں بس چند ماہ کی تو بات ہے..... مگر وہ تو اب اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈرتا ہے..... اس کی حمایت میں اب وہ بھلا کیا بولے گا.....؟ استری ہونا وہ بھی چھدرا استری ہونا کتنا بڑا پاپ ہے؟

سورج کی روشنی پھیلنے سے پہلے ہی وہ دور بہت دور ایک اندھی گلی میں گم ہوگئی تھی..... ایک ایسی گلی جس کا اسے نہ تو اُور معلوم تھا نہ چھور۔ بس چلتی چلی جارہی تھی، بے سوچے سمجھے صرف قدم آگے بڑھتے جارہے تھے۔ پیاس سے اس کے ہونٹ پر پپڑیاں پڑ رہی تھی۔ پاؤں دھول سے اٹے ہوئے تھے مگر منزل نامعلوم! رہ رہ کر اسے لگتا جیسے پروشتم آکر اس کے سامنے کھڑے ہوجائیں گے..... کہاں چلی جارہی ہے رے!

اچانک اسے لگا جیسے سچ میں اس کے پیچھے پیچھے کوئی آرہا ہے۔ دل چاہا پیچھے مڑ کر دیکھے مگر دیکھنے کی بجائے وہ اور تیزی سے آگے بھاگنے لگی۔

صبح شام میں بدل چکی تھی، دن بھر چلتے چلتے وہ تھک گئی تھی کہ اچانک پیچھے سے اسے کسی نے اپنی اور کھینچ لیا۔ وہ گرتے گرتے بچی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو پروشتم کے گھر کا بوڑھا مالی بری طرح ہانپ رہا تھا اسے اپنی اور دیکھتے پا کر اس نے فوراً گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''چل بیٹی! میرے گھر چل..... میں تجھے کوئی دکھ نہیں دونگا''۔ ''تجھے پڑھا لکھا کر اونچی اُڑان دوں گا..... پھر ذرا رک کر لڑکی کے پریشان چہرے کو ہمدردی سے دیکھتے ہوئے بولا: آج کے اخبار میں پڑھا تیری جیسی ہی ایک غریب لڑکی نے پڑھ لکھ

کر اپنے سماج کا مان سمان بڑھا ہے۔"

لڑکی بغیر کسی مداخلت کے دھیر دھیرے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی تھی۔ یہ اس کی مجبوری بھی تھی اور کمزوری بھی۔ اس کے ذہن پر بس ایک ہی سوال ہتھوڑے برسا رہا تھا۔

"گریب (غریب) باپ کی بیٹی ہوں نا، جلّت (ذِلّت) تو میرا مکدر (مقدر) ہے —— اب آگے کیا ہوگا یہ تو بھگوان جانے.....؟

☆☆☆

رشتے کی پہچان

اس نے ایک گہری نظر اس کے سراپا پر ڈالی اور چند لمحوں تک مبہوت بنا رہا۔
''یا اللہ! اس عمر میں بھی ایسی تروتازگی —— لباس پہننے کا سلیقہ تو دیکھئے!'' ہلکے سبز رنگ کی ساڑی میں سیاہ زری باؤڈر اور سنہری پائپن لگی سیاہ بلوز، اس کی گوری رنگت پر خوب جچ رہا تھا، مانو وہ پریوں کے دیس سے آئی ہو۔ چمکتے ہوئے سیاہ بال جو اس کی کمر کو چھو رہے تھے اور بڑے سلیقے سے ترشے ہوئے تھے، آنکھیں مدھ بھری کچھ اداسی اور کچھ پراسراری کیفیت لیے ہوئی، لب موٹے ضرور تھے مگر نارنگی کی قاش کی طرح رس بھرے بھرے سے۔ قیامتِ قامتاں، مژگاں درازاں کی تراکیب اس نے کبھی شاعری میں پڑھی تھی لیکن یہاں پر وہ اس کا مکمل جلوہ دیکھ رہا تھا۔ سب سے زیادہ مدہوش کن تو اس کی آواز تھی۔ جب وہ گویا ہوئی تو اسے لگا جیسے دور کہیں نقرئی گھنٹی سی بج رہی ہو یا کوئی آبشار دھیرے دھیرے گر رہا ہو۔ پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ اس کی عمر پینتیس سے تجاوز کر چکی ہے مگر ملازمت کے لیے جب اس نے اپنا Age سرٹیفکٹ دکھایا تو یقین کرنا ہی پڑا کہ 35 ہی نہیں وہ تو +35 میں جا چکی ہے، کچھ نہیں تو دو ایک سال تو ضرور ہی —— دل میں اٹھتے ہوئے تجسس سے مجبور ہو کر اس نے آخر پوچھ ہی

لیا: ''اتنے دنوں سے آپ کہاں تھیں؟ اب تو سرکاری ملازمت کی عمر آپ پار کر چکی ہیں..... مجھے افسوس ہے.....''

''ہوں'' اس نے دکھی لہجے اور التجا بھری نظروں سے اسے دیکھا اور بولی:

''کیا میں Affidavit کرا کر Age سرٹیفکٹ نہیں دے سکتی؟''

''اب ایسا کوئی پروپوزل تو ہے نہیں میڈم! یہ تو بہت پہلے کی بات ہے جب عورتوں کی عمر بھی پردے میں رکھی جاتی تھی۔'' وہ اپنی بات سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی، دیگر ممبران بھی خموشی سے دیکھ رہے تھے۔ پان چبانے کی کچھ عجیب عادت تھی اس کی، منہ اگلدان بنا ہوا تھا، ڈر تھا کہ ایک ذرا غفلت ہوگی تو پان کی پیک باہر آ جائے گی۔ غالباً اسی لیے وہ بیحد محتاط ہو کر گفتگو کر رہا تھا۔

چپراسی دروازے پر کھڑا ہوا تھا کہ بغیر اجازت کوئی اندر نہ آ جائے۔ باہر بھیڑ امڈتی چلی آ رہی تھی جسے دیکھ کر چپراسی سوچ رہا تھا: ''کتنا وقت لے رہی ہے یہ ایک عورت..... ابھی تو..... باپ رے! آج پھر رات ہو جائے گی..... صاحب لوگ کے پاس تو گاڑی ہے، گرم سوٹ ہے مگر ہم غریب لوگ اس ٹھنڈ میں پیدل چلتے چلتے.....''

وہ خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔ بھگوان نے ہم انسانوں کے کتنے روپ بنائے ہیں، کوئی صاحب، کوئی غلام، کوئی بادشاہ، کوئی ملکہ اور کوئی ملکہ کی اترن پہننے والی دایا..... پرماتما! تیرے کھیل بھی بڑے نیارے ہیں.....'' باہر کے شور و غل نے اس کے دھیان کو تتر بتر کر دیا، ایک آدمی چلا رہا تھا: ''ہم رات بھر کھڑے ہی رہیں گے کیا؟''

''آپ کو کھڑے رہنے کے لیے کس نے کہا ہے، جا کر بیٹھیے! نام آنے پر

آپ کو پکار لیا جائے گا.....''

کیا خاک بیٹھوں..... بیٹھے بیٹھے تو.....

باس کے کانوں تک شور وغل کی آواز آئی تو اس نے فوراً دوسرے نام کا اعلان کروا دیا۔ عورت گھبرا کر کھڑی ہوگئی اور اداس نظروں سے ممبران کو دیکھتے ہوئے بولی: ''.....آپ ہی لوگ میرے لیے کوئی اپائے نکالیے سر! سرکاری نہیں تو پرائیوٹ ہی سہی..... جینے کے لیے کوئی سہارا تو مل جائے..... میرے کمزور کاندھے پر پورے پریوار کا.....'' ان میں ایک معمر ممبر نے قدرے افسوس سے کہا۔ ''.....آپ کے دکھ کو ہم لوگ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں، ہم لوگ بھی جانتے ہیں کہ آج جہاں عورتوں کو مردوں کی برابری مل گئی ہے تو پریوار چلانے کا کرب بھی انہیں جھیلنا پڑ رہا ہے..... مگر آپ ہی سوچئے ایسے کیس میں ہم لوگ کر کیا سکتے ہیں.....؟''

دوسرے نے فلسفیانہ انداز اختیار کیا ''.....وقت بڑا جادوگر ہے۔ کس طرح ہمارے درمیان سے ہو کر دبے پاؤں گذر جاتا ہے کہ جب وہ گزرا ہوا کل بن جاتا ہے تو ہمیں خیال آتا ہے کہ آہ! ہم بڑے خسارے میں رہے، ایک قیمتی دن اور ہمارے ہاتھوں سے پھسل گیا.....''

''—— سر! آپ کی بات سمجھ رہی ہوں مگر مجھے نوکری.....'' وہ پورے دعوے کے ساتھ مطالبہ کر رہی تھی —— ان لوگوں نے مسکراتے ہوئے اسے بغور دیکھا —— باس نے آہستہ سے کہا: ''کوشش کرتا ہوں مگر فی الحال کوئی وعدہ نہیں کر سکتا .....اب حالات پہلے سے بہت بدل چکے ہیں ——'' اسی وقت پیون سلام کرتے

ہوئے میز پر رکھے ہوئے گلدان سے مرجھائے ہوئے پھولوں کو نکال کر ان کی جگہ نیا گلدستہ لگا دیتا ہے۔

خوب بہت خوب، ایک آدمی نے تعریف کی، مگر باس نے قدرے خفگی کا اظہار کیا: ''آج تم پھر بہت دیر سے آئے ہو؟''

''جام میں پھنس گیا تھا حضور!'' اس نے شرمندگی کی بجائے سر اٹھا کر جواب دیا۔ ''آج کل تو یہ روزمرہ کا محاورہ بن گیا ہے۔'' ان کی نگاہیں خشمگیں تھیں وہ پھر سے مخاطب ہوئے۔ ''آپ جائیے! دیکھئے باہر کس قدر ہنگامے ہو رہے ہیں۔''

''کل ایک بار پھر آپ سے ملنے کی اجازت چاہوں گی سر! (آواز سراپا التجا میں ڈوبی ہوئی تھی) کس وقت آؤں سر؟''

''اسی وقت''۔ وہ تحکمانہ لہجہ میں بولے۔ ''شکریہ! بہت بہت شکریہ!!'' وہ فوراً ایر کنڈیشن روم سے نکل کر باہر سڑک پر آ گئی تھی —— کول تار کی چمچماتی ہوئی سڑک جس کے دونوں اطراف میں فلک بوس عمارتیں کھڑی تھیں —— وہ حیرت سے ان نئی تعمیرات کو دیکھ رہی تھی۔ اس جگہ کا تو نقشہ ہی ایکدم بدل گیا ہے —— اس کے ذہن میں وہی محل نما گھر تھا، جو پہلے کئی آنگنوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوا تھا، دیکھتے دیکھتے کیسے بے آنگن ہو چکے ہیں یہ گھر —— تمام کھلی ہوئی کشادہ زمینیں سمٹ سمٹا کر بلند و بالا کمپلکس (Complex) میں بدل چکی ہیں، جہاں اجنبیت کے سایے پھیلتے چلے جا رہے ہیں ——

ذرا دیر بعد اس نے گہری سانس لیتے ہوئے سامنے سے گذرتے ہوئے

ایک رکشا پولر کو آواز دی: ''خالی ہے جی؟'' نفی میں گردن ہلا کر وہ آگے بڑھ گیا——
اسی طرح کئی گزرتی ہوئی سواریوں نے جب شانِ بے نیازی سے نفی میں سر ہلا دیا تو
پہلی بار اسے اس بات کا احساس ہوا کہ لوگ کہتے ہیں ہمارے دیس میں غریبی ہے،
بے روزگاری اور بھوک مری ہے مگر دیکھنے میں تو کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ اگر واقعی انہیں
پیٹ کی آگ ستاتی تو اس طرح ..... آج غریبی اور بے روزگاری تو صرف مڈل
کلاس کے حصے میں آگئی ہے۔ وہ جو اپنی مرضی سے جینے کی ادا بھی بھول گئے ہیں
کیونکہ وہ اپنی حیثیت سے نیچے بھی نہیں اتر پاتے ہیں اور نہ اوپر چڑھنے کی ہی ان کی
صلاحیت اب رہی—— وہ تو پنڈولم بنے ہوئے مستقل جھول رہے ہیں..... کچھ آگے
بڑھنے کے بعد رکشا تو اسے مل گیا مگر شام تیزی سے رات میں ڈھل چکی تھی۔ وہ آگے
بڑھتی جا رہی تھی اور سوچ کے حصار میں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھی، سڑک پر ایک قطار
میں ٹیکسی کاریں، بسیں، ٹیمپو اور اسکوٹر دوڑ رہے تھے۔ پہلو بہ پہلو رکشا پولر بھی ہانپتے
کانپتے ہوئے ہاتھ پر رکشا کھینچ رہا تھا—— دونوں جانب جگمگ کرتی ہوئی رنگ
برنگی دوکانیں سجی ہوئی تھیں۔ یہاں کی چہل پہل میں ایک ایسی رنگا رنگ تصویر تھی جو
شاید اس دیش کی اصل پہچان ہے—— اسے فکر اس بات کی ہو رہی تھی کہ اگر کل بھی
اسے نوکری نہ ملی تو کب تک اس عالم میں جیا جا سکتا ہے؟ یوں تو زندگی شروع سے ہی
کانٹوں بھری رہی ہے مگر اب تو..... واقعی کانٹے اتنے گھنے ہو چکے ہیں کہ سانس لینا
بھی دشوار ہو رہا ہے—— جب سے ایک معمولی سی دشمنی میں اس کا خاوند اس کی
نظروں کے سامنے گولیوں کا نشانہ بن گیا، دو دودھ پیتے بچے اناتھ ہو گئے—— تو وہ

میکے چلی آئی، جہاں بیمار ماں تھی اور ایک چھوٹا بھائی لیکن وہ لوگ تو خود جینے کے لیے سہارا مانگ رہے تھے——

گھر آچکا تھا، ایک تنگ و تاریک گلی سے گزرتے ہوئے وہ گھر کے قریب جب پہنچی تو گھنٹی کی آواز سن کر دونوں بچے دوڑ کر ''ممی آئی..... ممی آئی'' کی رٹ لگانے لگے۔ اس نے پرس کھول کر رکشا والے کو مرے چرے دس دس کے دو نوٹ تھما دیے اور دونوں بچوں کی انگلی تھام کر اندر داخل ہوگئی۔ بوڑھی ماں کھانستی ہوئی مخاطب ہوئیں:

''ارے! تو بھی کمال کرتی ہے، دن بھر کہاں چلی جاتی ہے؟ آخر کب تک.....؟'' پھر زور زور سے وہ کھانسنے لگتی ہیں..... لونڈا ابھی پتہ نہیں کہاں گم ہے.....؟''

——''ماں! میں گھومنے تھوڑے گئی تھی..... میں تو تمہیں لوگوں کے لیے.....!''

''پتہ ہے بیٹی..... پتہ ہے..... مگر کیا کروں اب مجھ سے.....'' کھانسی کا دورہ پھر شروع ہو چکا تھا اور کھانستے کھانستے آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں.....

''—— چپ رہو اماں! زیادہ بولنے سے تمہیں.....'' وہ پیٹھ سہلانے لگتی ہے۔

''ہاں بیٹی! اب تو میں چپ ہی ہو جاؤں گی..... بس تھوڑے دن اور.....''

وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ چکی تھی——

''مما کہاں ہے بیٹا؟''

''کھیلنے گئے ہیں''۔

''عجیب لڑکا ہے..... اسے کھیل کے سوا کچھ.....''

''..... ممی! ہم نانی کے لیے چائے بسکٹ لانے گئے تھے تو دوکاندار انکل بول رہے تھے اب تمہیں ادھار نہیں دوں گا —— پہلا پیسہ لاتب ہی چائے لے جا ..... ''ممی پیسہ دو نا بہت بھوک لگی ہے۔ میں چائے لاتی ہوں..... تم لوگ یہیں بیٹھو!

ذرا دیر بعد وہ اندر آئی اور سب کو چائے بسکٹ کھلا کر خود بستر پر دراز ہوگئی —— گھر کی اس بدحالی سے اب وہ بہت تھک چکی تھی، جب تک ماں صحت مند تھی زندگی کا یہ بوجھ اس قدر بھاری نہیں لگ رہا تھا مگر اب تو..... اب تو..... ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ وہ ابلہ نہیں..... کمزور بھی نہیں مگر پھر بھی..... بیٹا بیٹی ایک سمان صرف کہنے کی بات ہے..... عمل میں تو کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ جب کہ اماں کو پھر کھانسی کا دورہ شروع ہو چکا تھا، بچے بھی بھوک سے بلبلا رہے تھے۔ ''کب تک سوؤ گی مما! کھانا ..... آج کون بنائے گا.....؟

''تمہارا مما جو اب تک باہر گھوم رہا ہے..... خود کہیں سے کھا کر آئے گا اور چادر تان کر سو جائے گا..... بغیر گارجین شپ کے ایکدم بگڑ چکا ہے یہ لڑکا.....!''

صبح دیر سے آنکھ کھلی..... کڑی دھوپ ہر سمت پھیل چکی تھی: اماں بھی گہری نیند میں خراٹے لے رہی تھیں، بچے بھی سوئے ہوئے تھے —— اسے سر میں تھوڑا بھاری پن محسوس ہو رہا تھا۔ سوچ و فکر میں رات نیند بھی اسے اچھی نہیں آئی تھی.....

اِدھر اُدھر کے کام نپٹانے کے بعد وہ سہ پہر باہر نکلنے کی تیاری کرنے لگی، اسے تیار ہوتے دیکھ کر بچوں نے کہا''..... آج پھر کہاں جا رہی ہو ممی؟ ہم بھی تمہارے

ساتھ چلیں گے —— دونوں بچوں نے ضد کی..... ماں نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا —— بھائی منہ بنا کر بولا: ''سیر سپاٹے کا یہ اچھا بہانہ ہے آپی! گھومئے خوب گھومئے..... آج بھی آپ کو نوکری نہیں ملے گی..... کل پھر اسی طرح بن سنور کر.....

''ارے! یہ تو کیا بول رہا ہے؟ تجھے ذرا بھی شرم نہیں کہ تو اپنی بڑی بہن سے جو تیری ماں برابر ہے.....''

''—— مگر ماں تو نہیں ہے نا.....؟ اس نے برجستہ مسکراتے ہوئے جواب دیا اور وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی —— دل چاہا کہ ایک زبردست طمانچہ اس کے منہ پر رسید کرے مگر وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے کہ کہیں وہ گھر چھوڑ کر ہی بھاگ نہ جائے ..... وہ خاموش تلملاتی رہی..... اف! زمانہ کتنا خراب آ گیا ہے..... بیٹا، بھائی، باپ، شوہر سب رشتے اپنا اعتبار کھوتے جا رہے ہیں، خون کا رشتہ تو اب..... اپنی پہچان ہی کھو چکا ہے، خاص کر اس طبقے میں جہاں غربت کی بھٹی جل رہی ہے۔

وہ اپنی قسمت پر ماتم کر رہی تھی اور کل اور آج میں جو تبدیلی آئی ہے اس پر بھی غور کر رہی تھی..... ذرا دیر بعد ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ وہ گھر کی دہلیز سے باہر جا چکی تھی۔

جب وہ دفتر پہنچی تو صاحب وقت دینے کے باوجود دفتر چھوڑ چکے تھے۔ اس نے فوراً گھڑی دیکھی۔ ابھی وقت تو زیادہ نہیں ہوا ہے..... وہی وقت تو ہے جو انہوں نے دیا تھا..... چپراسی سے وجہ دریافت کی تو وہ کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

''میڈم جی! یہاں تو روز ہی ایسے ایسے وعدے ہوتے ہیں..... بحالی تو جو ہونی تھی کل

ہو چکی، اب..... گھر کے کام کاج کے لیے بھلے صاحب..... حالاں کہ اس سے تو اچھا ہے کہ آپ..... کسی دوکان میں.....''

وہ جانے کے لئے مڑ چکی تھی پھر اچانک اسے اپنے بھائی کی وہ بات یاد آ گئی کہ ''سیر سپاٹے کا یہ اچھا بہانہ ہے آپی! گھومئے خوب گھومئے.....!'' وہ کیا جواب دے گی اگر آج بھی نوکری نہیں ملی تو..... تو..... کچھ دیر وہیں بنچ پر بیٹھ کر وہ سوچتی رہی..... باس کا انتظار بھی کرتی رہی..... پھر جب آفس میں تالہ لگنے لگا تو وہ چپراسی سے مخاطب ہوئی:

''بھیا! آپ کیا بتا رہے تھے..... کسی دوکان میں.....؟''

''ہاں! سیلس گرل کی ضرورت ہے.....''

''مگر مجھے یہاں پہچانتا کون ہے..... کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں.....؟''

چپراسی نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا اور آہستگی سے بولا۔ ''چلئے! آپ نے مجھے بھیا کہا ہے تو اس شبد کی لاج تو رکھنی ہی ہوگی''..... وہ مسکرا رہا تھا۔

وہ اس کے ساتھ سڑک پار کر کے ایک دوکان میں پہنچ چکی تھی، جہاں Ladies سامان کی بھرمار تھی، دوکان کے مالک سے بات کرنے کے بعد وہ کاؤنٹر پر آ کھڑی ہوئی اور جینے کے اس نئے سہارے پر تھوڑا مطمئن بھی ہوئی اور بہت دکھی بھی ——— اسے یاد آ رہا تھا کتنی دشواری کے ساتھ اس نے پوسٹ گریجویٹ تک کی ڈگری حاصل کی تھی۔ دل نے کہا:..... ''کیا ہر خواب آدمی کے پورے ہو جاتے ہیں.....؟''

چپراسی نے ہمدردی کے ساتھ اسے دیکھا: ''دیدی! اب میں جاتا ہوں۔''

شکریہ ادا کر کے بے دلی کے ساتھ وہ پھر کاؤنٹر پر آ گئی تھی، اور سوچ رہی تھی:

''—— خون کے رشتے سے تو بہتر یہی (غیر قوم کا) بھائی ہے جس نے اس کے درد کو سمجھا!

☆☆☆

واھمہ

اس کے کانوں میں آواز آ رہی تھی یا شاید دور کہیں ٹیپ پر کوئی نغمہ مچل رہا تھا۔

''میں اور وہ/ دور تک/ اور دیر تک
ایک ساتھ چلتے رہے/ ہم دونوں میں ربط باہمی تو تھا
لیکن ایک جان، دو قالب کبھی نہ بن سکے
سرحدِ ادراک کو چھو کر مجھ پر
منکشف ہوا کہ وہ کوئی اور نہیں/ میری زندگی تھی

اس کے اندر درد کی ایک تیز لہر اٹھی۔ اس نے محسوس کیا یہ گانٹھ آج کوئی نئی نہیں ہے مگر درد کا اس قدر شدید احساس پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ احساس تو آج بالکل نیا نیا سا ہے۔ اور مرض کا احساس ہی تو اصل ..... اصل مرض کی شروعات ہے ..... ایک لمحہ کو وہ پریشان سی لگی مگر ذرا ہی دیر میں اُس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا، شاید وہ اس ادا میں بڑی مہارت رکھتی تھی۔ ایک اچھی اداکارہ کی طرح ہر غم کو، ہر درد کو اندر ہی اندر چھپا لینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف، یہ صرف .....

اُس کی سوچ الجھتی جا رہی تھی اون کے نرم رنگین (نیلے) گولے اس کی گود میں دھرے تھے اور دونوں ہاتھ تیلیوں کے اتار چڑھاؤ میں مصروف..... اُس نے ادھ بنے سوئٹر کو بستر پر ڈال کر ہاتھ سے ناپنا چاہا..... پھر دھیرے سے بولی..... ابھی تک تو بانہہ تک بھی نہیں پہنچی..... پتہ نہیں اب آگے بُن بھی سکوں گی یا نہیں؟ ڈاکٹر کو اگر دکھایا اور کہیں..... کہیں، فالتو قسم کے خیالات سر اٹھانے لگے..... ایک عجیب ادھیڑ بُن میں وہ الجھتی چلی گئی.....

میں اپنی بیاہتا زندگی کے بیس سال گزار کر بھی، یہ کتنی نئی نئی سی ان بوجھی پہیلی کی طرح ہے..... کتنے خوشگوار رشتے ان دونوں کے ہیں..... مگر یہ درد کی گانٹھ..... اچانک ساری توجہ کا مرکز درد کی گانٹھ..... معمولی سی گانٹھ تو ہے..... خوامخواہ..... اناپ شناپ میں ذہن کیوں الجھ جاتا ہے۔

ادھ بُنی سوئیٹر کو باسکیٹ میں ڈال کر وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ شام آہستہ آہستہ زینہ چڑھ رہی تھی، سورج کی شعائیں نارنجی رنگ میں شرابور در و دیوار کو گلنار بنا رہی تھیں۔ ڈوبتا سورج بھی کتنا خوبصورت معلوم ہوتا ہے ایک عجیب سا تصور اس کے ذہن میں وحشت پیدا کرنے لگا.....

..... ڈوبتا سورج اور ڈوبتی زندگی..... اللہ توبہ..... اچھے خیالات میں زندگی ہے..... درد کا احساس کتنے درد جگا رہا ہے..... وہ اندر سے دہل رہی تھی۔ اکیلا پن، سونا گھر..... آج اسے اچانک گھائل کرنے لگا تھا۔

دروازہ کھول کر وہ باہر آ گئی۔ ''کہاں جاؤ گی؟'' اپنے آپ سے سرگوشی تھی۔

"کیا اپنے خیال کی دنیا سے بھی نجات ہے؟"

کچھ دیر کی چہل قدمی کے بعد وہ پھر گھر کے اندر آ جاتی ہے اور دروازہ احتیاط سے بند کر لیتی ہے۔ ٹی وی کھول کر دل بہلانا چاہتی ہے مگر آج دل کسی صورت بہل نہیں رہا تھا۔ ٹیلی ویژن چینل پر بھی کچھ ویسے ہی اٹ پٹے سے سین نظر آئے..... اندر اور باہر کی دنیا میں کتنا گہرا رشتہ ہے۔

ذرا ہی دیر میں اکتا کر اس نے ٹی وی بند کر دی۔ کچن میں جا کر چائے بنانے میں مصروف ہو گئی۔ "کہتے ہیں آگ ....." پھر یہ کیا بکواس، وہ سوچنے لگی — خدانخواستہ ایسا کیوں ہونے لگا۔ اچانک اسے اپنی بیمار سہیلی رشمی یاد آ گئی، کیسی اچانک موت اُس کی بھی ہوئی تھی..... مگر وجہ تو کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکی تھی..... عورت ذات کی موت بھی اس کی زندگی کی طرح ہی ہزاروں پردوں میں سمٹی رہتی ہے۔ چائے پینے کے بعد اچانک وہ ٹیلی فون کا ڈائل اٹھا لیتی ہے..... "ہیلو انجم!..... میں..... بول رہی ہوں؟..... ارے کچھ نہیں،..... بس یونہی..... خیال آیا..... رشمی کے بچے کہاں ہیں؟ ..... اُس کے خاوند نے تو دوسری شادی کر لی ہے نا.....؟ ہاں! دیکھو نا آج..... خواہ مخواہ وہ کیسے یاد آ گئی، اس کو مرے ہوئے بھی تو سات سال ہو چکے ہیں۔ مگر بعض یادیں ذہن کا حصہ بن جاتی ہیں..... ارے ہاں کل میں بھی..... ڈاکٹر سے ملنا چاہتی ہوں ..... بس یونہی، کوئی خاص بات نہیں..... درد ہاں گانٹھ..... نہیں گھبرا نہیں رہی ہوں..... بس بس ایک خیال آ گیا"۔ اس نے ڈوبتی آواز میں کہا اور بستر پر لیٹ گئی مگر آج آرام کرنے میں بھی بے چینی تھی۔ انجم کے بعد پھر تھوڑی دیر میں ٹیلی فون کے نمبر ملانے

لگی۔ ''پریتی..... ارے کیسی ہو؟ بھول گئی نا..... ہاں..... اچھے دن کے تو سبھی دوست ہوتے ہیں..... بُرے دن کا کوئی ساتھی نہیں..... نہیں بکتی نہیں ہوں..... سچ بالکل سچ ..... بکواس نہیں دوست..... سچ بالکل سچ..... کل ڈاکٹر کے پاس جاؤں گی؟''

رات بڑی مشکل سے نیند آئی..... نیند کی گولی لینے کے بعد ذرا دیر کو آنکھ لگی ..... خواب میں بھی اوٹ پٹانگ..... بے سر پیر کی باتیں.....

صبح ناشتہ کے فوراً بعد وہ ڈاکٹر کے کلینک جا رہی تھی، دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہو رہی تھی۔ اللہ جانے رپورٹ کیا ہوگی.....؟ درد کا کھٹا میٹھا احساس اسے اپنی گرفت میں بھرپور طور سے لے چکا تھا۔ پریشانی اور جلدی میں اُسے چپل بدلنے کا بھی خیال نہیں رہا۔ رہ رہ کر بس ایک ہی خیال ذہن میں سر اٹھا رہا تھا۔

کلینک پہنچی تو ڈاکٹر ندارد..... بہت دیر تک انتظار کے بے صبر لمحات سے گزرنے کے بعد ڈاکٹر آئے..... مریضوں کی لمبی قطار..... اُف آج کے زمانے میں ڈاکٹر کو دکھانا بھی کتنا مہنگا پڑ رہا ہے..... وقت..... پیسہ..... اطمینان..... سکون، سب غارت..... بے صبر انتظار کے بعد ایک آواز آئی۔

میڈم! آپ کا نمبر ہے اندر جائیے..... ہاں وہاں بیٹھ جائیے!

ڈاکٹر نے بھرپور توجہ سے دیکھا —— وہ آج بُری طرح نروس تھی، پتہ نہیں ..... زندگی..... اب کیا موڑ لے گی.....؟

ڈاکٹر کی گہری خاموشی اُسے مزید پریشان کر رہی تھی، آخر ضبط کا پیمانہ چھلک پڑا.....

''ڈاکٹر صاحب!''

''ہوں.....''

''رپورٹ آپ نے دیکھ لی.....؟''

عالم اضطراب میں —— ''پھر.....؟''

پھر کیا؟

''میں..... کس مرض میں مبتلا ہوں.....؟''

''محض..... شک کے مرض میں.....'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شک..... واقعی شک.....!'' وہ بے قرار ہو اُٹھی۔

''جی ہاں! بالکل شک، واہمہ..... واہمہ کا بھوت آپ پر سوار ہے.....'' ڈاکٹر پُرسکون مسکراہٹ چہرے پر بکھیرے تھا۔ گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی..... ''ویسے آپ لیٹ جایئے! میں ایک بار پھر چیک کر لیتا ہوں اور آج آخری بار کہہ رہا ہوں، آپ جیسے پڑھے لوگ بے موت مر جاتے ہیں..... ہر مرض..... ہر گانٹھ کینسر نہیں —— کینسر نہیں، یہ ایک بھوت ہے..... جس میں آج کا 80% مریض گرفتار ہے۔ خود بھی پریشان —— ڈاکٹر کو بھی پریشان کیے رہتا ہے''۔ ڈاکٹر نے آلے کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے اُسے اٹھ جانے کی ہدایت کی.....

وہ لمبی گہری سانس لے رہی تھی جس میں اطمینان بھی تھا اور یہ شک بھی کہ کہیں ڈاکٹر اسے مغالطہ تو نہیں.....؟ پھر خود ہی مسکرا پڑی۔ ''ٹھیک ہی کہتے ہیں شک کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا.....''۔

☆☆☆

الماری کی زینت

وہ شہر کے ایک نامی گرامی پروفیسر تھے۔ اُن کے علم و دانش کا ہر طرف چرچا تھا۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ چراغ تلے اندھیرا۔ سو یہ مثل خود ان کے گھر پر بھی صادق آتی تھی۔ وہ اردو کے اسکالر تھے مگر خود ان کے گھر میں ایک بھی اردو پڑھنے والا نہیں تھا —— بچے تو شروع سے ہی غریب اردو سے نفرت کرتے تھے اور کیوں نہ کرتے جب ماں باپ میں سے کسی کو اس بات کی فکر نہ تھی کہ آنے والی نسل میں اُن کا گھر ''اردو دشمن'' یا ''قاتلِ اردو'' کے القاب سے نوازا جائے گا۔

باپ ہمہ وقت لکھتے پڑھتے، ان کی شہرت دور دور تک تھی، اپنی علم دانیوں کے لیے وہ اردو کے نام پر بڑے بڑے اعزازات اور انعامات حاصل کرتے مگر اپنے بچوں کو کبھی ایک رسالہ بھی اردو کا اُلٹنے نہیں دیتے۔ ناول پڑھنے کی بالکل اجازت نہیں۔ قصہ، کہانی، شاعری بھی ناجائز اولاد کی طرح معتوب نگاہوں سے دیکھی جاتی، جب کہ ٹی وی، ٹیپ اور ریڈیو پروگرام ہر وقت کھلے رہتے —— بھلا اس میں بچوں کا کیا قصور تھا؟ جب گھر کے بڑے بوڑھے یہ کہتے ہوئے سنے جاتے کہ ''پڑھیں فارسی بیچیں تیل، دیکھو بھئی قدرت کا کھیل'' تو ایسے میں بچے تو خیر بچے

تھے۔ کانونٹ اسکول میں داخلہ لینے کے بعد وہ انگریزی تو فرفر بولنے لگے لیکن اردو لکھنا پڑھنا اور بولنا مانو ان کی نگاہ میں کوئی ہتک کی بات ہو، اس سے حتی الامکان گریز کرنے لگے۔ البتہ پروفیسر صاحب کی اہلیہ محترمہ کو شعر و شاعری سے خصوصی دلچسپی تھی۔ جب کبھی باہر کی بیٹھک میں مشاعرے کی محفل آراستہ ہوتی تو وہ تمام کام دھام چھوڑ چھاڑ کر چلمن سے لگی ہمہ تن گوش رہتیں، رات گئے تک شعر و شاعری کا دور چلتا رہتا، داد و تحسین کے نعرے بلند ہوتے رہتے محترمہ پردے کے اندر سے ہی اچھے و برے شعر کی تمیز کرتیں اور دل ہی دل میں خوبصورت اشعار پر پھول کی طرح کھل پڑتیں ـــــ لیکن پروفیسر صاحب نے ان کی اس کیفیت کو کبھی محسوس نہیں کیا۔ شاید وہ خود اپنا اظہار نہیں چاہتی تھیں، انہیں ڈر تھا کہ بچوں کی طرح کہیں انہیں بھی اس محفل سے دھتکار نہ دیا جائے۔ کیوں کہ اگلے زمانے میں شعر و شاعری کا ذوق ایک پردہ نشیں کے لئے ہنر نہیں، بلکہ عیب تھا۔ اسی لیے تو بیچاری کی کبھی اتنی بھی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اپنے خاوند کو ہی، اپنا ہمراز بنا لیتیں۔ جو موڈ میں ہوتیں تو کھانا بناتے بناتے لکڑی کے کوئلے سے دیوار پر کبھی زمین پر دو چار اشعار لکھ مارتیں اور اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتیں۔ بچے جب بڑے ہوئے تو ماں کی اس عجیب و غریب کیفیت کو بڑی سنجیدگی سے محسوس کرتے اور حیران ہوتے کہ آخر ممی کو یہ اچانک کیا ہو جاتا ہے۔ کیا ان پر کوئی آسیب آتا ہے؟ (اُس زمانے میں آسیب اور جن ماموں کی کہانی بچوں کو خوب سنائی جاتی تھی)۔ ممی روٹی توا پر چھوڑ کر، مطالعہ میں مشغول بچوں کی پنسل کھینچ کر اُنہیں کی رف کاپیوں پر آڑی ترچھی لکیریں بنانے لگتیں۔ ایک

دن ان کو کسی بچے نے ٹوک ہی دیا۔

''ممی پاپا کو دکھا آؤں کہ آپ شاعری بھی کرتی ہیں.....''

''نا بیٹا نا! ہرگز نہیں.....'' یہ کہہ کر وہ فوراً بچے کے ہاتھ سے کاغذ لے کر پھاڑ ڈالتیں اور گھبرائے ہوئے لہجہ میں بولتیں ''تم اچھے بیٹا ہونا، دیکھو ایسا کبھی نہیں کرنا .....'' بچے معصومیت سے چہرا دیکھنے لگتے۔ ان کا ننھا دماغ سوچتا شعر کہنے میں ایسی پردہ داری کیا ہے؟ ذرا دیر میں لکھنے کی بجائے ممی زیرِ لب کچھ گنگنانے لگتیں۔ ان کی آواز بھی غضب کی مترنم تھی مگر باقاعدگی سے انہوں نے کبھی نہ کچھ گایا نہ سنایا۔ شاید وہ صرف اپنے لیے گنگناتی تھیں۔ بچوں کو ماں کی یہ ادائیں بڑی پیاری لگتیں۔ مگر ماں کا اداس اور مضمحل چہرہ انہیں دکھ دے جاتا۔ وہ اکثر سوچتے ان کی ممی اوروں کی ممی سے کس قدر مختلف ہیں۔ دیگر بچوں کی ممی تو بہت بک بک جھک جھک کرتی ہیں، ہر وقت اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہیں۔ ہنگامے اور شور شرابے انہیں بے حد پسند ہیں، شاپنگ وغیرہ میں انہیں خصوصی مزہ آتا ہے مگر اپنی ممی تو تنہائی سے ہی دوستی رکھتی ہیں۔ یہ کیسی پُرسکون اور صاف ستھرے ذوق کی ہیں مگر پاپا کو ان کی یہ ادائیں کیوں اچھی نہیں لگتیں۔ وہ اکثر انہیں ڈانٹ پھٹکار سے کیوں اداس بنا دیتے ہیں۔

اُس وقت جو سمجھدار بچے تھے ان کی نگاہیں خواہ مخواہ کے لیے دہلیز پر لٹکے ہوئے اُس آہنی پنجرے کی طرف اُٹھ جاتیں جہاں ایک خوبصورت سا سبز مخملی پروں والا طوطا اپنی سرخ سرخ چونچ کو پنجرے کی جالی سے باہر نکالنے کے لیے بیتاب نظر آتا اور جب ناکام ہو جاتا تو پھر اسی آہنی پنجرے کے محدود دائرے میں چکر کاٹنے لگتا اور

بڑی میٹھی آواز میں ''ٹائیں ٹائیں'' کرتا۔ کبھی کٹوری میں ڈالے ہوئے دانے کو چگتا اور کبھی پانی کی ننھی کٹوری کو چنگل سے اُلٹ دیتا۔ ان بے مصرف کاموں میں طوطا کو مصروف دیکھ کر بچے بیحد خوش ہوتے۔ پروفیسر صاحب کے تمام بچوں کو یہ طوطا بیحد پسند تھا مگر ممی طوطے کو دیکھ کر کبھی خوش نہیں ہوئیں گرچہ وہ اس کا خیال سب سے زیادہ رکھتی تھیں، بچوں کو اکثر مشورہ دیتیں..... ''پیارے بچو! تم اس مظلوم پرندہ کو آزاد کر دو تو میں تمہیں.....'' اتنا سنتے ہی سب سے چھوٹی بچی گلا پھاڑ کر چیخنے لگتی..... ''نہیں ممی..... نہیں.....'' پھر وہ وہیں فرش پر پیر پٹخ پٹخ کر رونا شروع کر دیتی..... شامتِ اعمال اس وقت اگر ان کے پاپا آجاتے تو جھنجھلا کر کہتے۔

''تمہیں ان بچوں کو چڑھانے میں آخر کیا مزہ آتا ہے —— کئی بار کہہ چکا ہوں تم سے یہ طوطا..... یہ خرگوش..... یہ کتا اپنے بچوں کے دل بہلانے کے لیے خریدے ہیں میں نے، تم انہیں گھر سے باہر نکالنے کا حق نہیں رکھتیں.....'' پھر قدرے مذاق سے کہتے دیکھو بچو! ''میں آپ کی ممی کو ہی باہر کیے دیتا ہوں.....'' وہ بناوٹی غصے کے ساتھ ممی کو دھکے دے کر باہر کرنے لگتے۔ سب سے چھوٹی بچی بے تحاشہ دوڑ کر ماں کے قدموں سے لپٹ جاتی، اور پاپا کی جانب عتاب بھری نظروں سے دیکھتی اور پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز میں رونے چلانے لگتی —— ماں بچوں کے اس والہانہ پیار کو دیکھ کر مسکرانے لگتی اور سوچتی ''واقعی ماں بننا بھی قدرت کا ایک انمول تحفہ ہے..... اگر عورت کو یہ وصف حاصل نہ ہوا ہوتا تو.....'' وہ اس سے آگے کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی یا شاید اس سے زیادہ سوچنے سمجھنے کی اُنہیں کوئی ضرورت ہی نہیں تھی ——

لیکن وقت بھی کیا عجیب شے ہے؟ کس قدر تیز رفتار ہے..... ایک ہی دو نسل میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں؟ ایک دن ممی سوچ رہی تھیں کہ انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ خود ان کے گھر کی بچیاں پروفیسر اور انجینئر بن جائیں گی۔ اور وہ مردوں کے مقابل کھڑی ہو جائیں گی۔ اُن کی ایک بیٹی پروفیسر اور دوسری انجینئر۔ تینوں بیٹے بھی اچھی ملازمت میں آ گئے تھے۔ پروفیسر صاحب تو انتقال کر چکے تھے لیکن ماں کی سرپرستی میں بچے خود کو تنہا محسوس نہیں کر رہے تھے—— مگر ایک صبح ماں بھی حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اچانک چل بسی تھی۔ بچے اپنی ملازمت کے سلسلے میں پورے ملک میں بکھرے ہوئے تھے۔ ماں کی موت کے وقت سب بھائی بہن یکجا ہوئے اور موت کے چند روز بعد جب پرانے کاغذات نکالے گئے تو ہر طرف کتابیں ہی کتابیں بکھر گئیں۔ ان میں زیادہ تر اردو ادبیات کی نادر اور قیمتی کتابیں تھیں۔ رسائل، ڈکشنریاں، نوٹ بکس اور شعری بیاض تھے—— بچوں نے ایک کباڑیا کے ہاتھوں انہیں ردی کے بھاؤ منٹوں میں بیچ دیا۔ اُن کو بیچتے وقت کسی کے دل میں ایک ذرا کرب نہ ہوا کہ یہ ان کے والدین کی محبوب نظر اشیا تھیں، یہ ان کی وہ پسندیدہ کتابیں تھیں جنہیں وہ تنگ دستی میں بھی خرید رہے تھے..... اور ان کی قیمت اب بھی ردّی کے بھاؤ بکنے کی نہیں تھی، وہ کسی بک سیلر سے اگر معاہدہ کئے ہوتے یا پھر کسی لائبریری کو نذر کر دیتے تو شاید اس سے اچھی قیمت انہیں مل جاتی۔ مگر بچے تو شاید اب بھی بچے ہی تھے۔ والدین نے اردو کی الف بے سے بھی اُن کی شناسائی نہیں کی تھی، بھلا وہ کیسے ان بیش بہا کتابوں کی قیمت پہچانتے؟

کباڑیا اپنے میلے کچیلے بورے میں نہایت بے دردی کے ساتھ کتابوں کو ٹھونستا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔ گرمی کی چلچلاتی ہوئی دوپہر ہے۔ جھاڑو دیتے ہوئے بچوں کو اطمینان ہوتا ہے کہ ان کا گھر اب آلودگیوں سے پاک ہو گیا ہے—— کباڑیا سڑک پار کر کے ایک بنئے کی دکان پر جا پہنچتا ہے۔ وہاں پر اس وقت چند افراد خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ردی فروش نے دوکاندار کے سامنے بورا رکھتے ہوئے اُس کے بند ڈھیلے کئے اور بے دردی کے ساتھ اُن میں ٹھونسی ہوئی کتابوں کو فرش پر پھیلا دیا۔ وہاں پر بیٹھے ہوئے ایک حضرت کی نظر جب ان کتابوں پر پڑی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر فرش پر پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے اور اس سے پہلے کہ دوکاندار قیمت لگائے وہ جھٹ سے منہ مانگی قیمت دے کر ان خستہ حال کتابوں کے مالک بن بیٹھے۔ دوکاندار اور دوسرے حضرات حیرت سے اس خبط الحواس آدمی کا منہ تک رہے تھے جو سڑی گلی کتابوں کے لئے اتنے پیسے خرچ کر رہا تھا۔ ایک نے تو ٹوک ہی دیا۔

''ارے یار! ایسی دیمک زدہ کتابوں کے واسطے اتنے سارے پیسے خرچ کر دئے تم نے تھوڑی بارگینگ تو کرتے ..... ذرا تحمل کرتے تو وہ نصف رقم میں ہی دے دیتا——''

''جانے دیجئے میں ابھی بھی خوش ہوں .....'' یہ کہہ کر وہ تمام کتابوں کو سلیقے سے جھاڑ پونچھ کر اپنے گھر لے آئے۔ دیکھتے ہی ان کی اہلیہ چراغ پا ہو گئیں۔

''یہ کیا کباڑ خانہ لے آئے آپ؟ دیکھتے ہیں دیمک کھائے ہوئے ہیں

مدتوں سے اسے کسی نے ہاتھ تک نہ لگایا ہے——"

مرد نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

ہاں محترمہ! یہ اردو کی کتابیں ہیں—— ایک مرتی ہوئی قوم کی مرحوم نشانیاں ..... پھر بڑی طمانیت کے ساتھ اُنہیں وہ شیشے کی خوبصورت الماری میں سجانے لگا۔

☆☆☆

چاند اور چکور — کی کہانی

چاند اپنے مدار میں اس طرح چمک رہا تھا کہ گویا وہ آسمان کا شہزادہ ہو — آج آسمان اور دنوں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی نیلا اور روشن نظر آ رہا تھا — دُور گگن میں دو چار ستارے بھی کہیں کہیں سے آنکھ مچولی کر رہے تھے — چاند کی چمک ان کی چمک کو اُبھرنے نہیں دے رہی تھی۔ اُس نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ چاند کی اپنی روشنی نہیں ہے، تو یہ دوسروں کی روشنی لے کر اتنی چمک آخر کیسے آ جاتی ہے چاند پر؟ اُس کا ذہن ننھے بچوں کی طرح پُر تجسس بنا ہوا تھا۔ دوری کا سحر بھی کتنا رومانٹک ہوتا ہے؟ وہ سوچتے سوچتے کھلے آنگن میں لیٹا ہوا دنیا جہان کی سیر کرنے لگا — کبھی کتابی دنیا میں چلا جاتا اور اپنے مطالعے میں آئی ہوئی باتوں کا تجزیہ کرتا تو کبھی سامنے کے نظاروں کو آنکھوں میں اُتارنے کی کوشش کرتا۔ کبھی علامہ اقبالؔ کی نظم یاد آتی تو کبھی کسی سائنسی کتاب کی عبارت دماغ میں گونجنے لگتی، کبھی بچپن میں پڑھا ہوا یہ نغمہ

Twinkle Twinkle little star

How I wonder what you are?

کے بول لب پر مچلنے لگتے اور کبھی بادل میں چھپا چاند یاد آ جاتا، کبھی بیدیؔ کی کہانی

''گرہن'' کا چاند داغدار اندھیرا پھیلاتا نظر آتا، گویا ذہن نہ ہوا اک محشر خیال ہو گیا۔

اچانک کسی نے اتنی رات گئے دروازے پر دستک دی..... کون ہو سکتا ہے اس وقت.....؟

''آتا ہوں'' یہ بھی کوئی آنے کا وقت ہوا؟ دل ہی دل میں کہتا ہوا وہ ہینگر سے قمیص کھینچ کر بدن پر ڈالتے ہوئے باہر ورانڈے میں جا کر دروازہ کھولتا ہے، پھر خوشی سے گلے لگ جاتا ہے۔

''ارے تم! اتنے دنوں بعد —— کہاں تھے یار جانی؟''

پرتپاک انداز میں آنے والا بھی گلے لگا ہوا تھا —— چھوٹی سی بریف کیس ہاتھ میں لے کر وہ اندر داخل ہو گیا اور مسکراتے ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''ارے! تم تو ایکدم اکیلے میں ہو یار! بھابھی بچے.....؟''

''تم بھابھی سے ملنے آئے ہو یا مجھ سے.....؟''

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ''گھر تو عورت سے ہی.....''

''اور اگر صرف مرد ہو تو.....؟''

''گھر گھر نہیں لگتا ہے.....''

''خوب! اندر چلو۔ منہ ہاتھ دھولو یا نہالو جیسی خواہش..... ابھی تمہیں بغیر عورت کے شاندار کھانا کھلاتا ہوں۔ شاید عورت کھانے کے لیے ہی یاد کی جاتی ہے..... ہے نا؟''

وہ زور سے ہنسنے لگا تھا..... ''یہ تم نفسیات کے طالب علم کب سے بن گئے

ہو.....؟''

''نفسیات، ادبیات، سماجیات، معاشیات —— میں نے کیا کیا نہیں پڑھا ہے یار!''

''شاید اس تنہائی نے تمہیں کتابوں سے عشق کرنا سکھا دیا ہے.....؟''

''شاید ایسا ہی سمجھو!''

''واقعی بھابھی کہاں ہیں.....اب تو بولو.....؟''

''بعد میں بتاؤں گا.....ابھی کھانا کھاؤ! مجھے بھی بھوک لگی ہے۔ آج بہت تھک گیا تھا آفس میں اسی لیے.....''

ذرا ہی دیر میں ڈنر ٹیبل پر مختلف قسم کے لوازمات سجا دیے گئے تھے جنہیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اس گھر میں کچھ تو اسراریت ہے بغیر عورت کے ہاتھ لگے اس قدر ذائقہ دار کھانے.....؟

وہ کھا کم رہا تھا اور کھانے کی تعریف زیادہ کر رہا تھا، شاید اس لیے بھی کہ اُس کی نگاہیں ابھی بھی اس گھر میں عورت کو ڈھونڈ رہی تھیں —— ہر چیز نہایت سلیقے سے آراستہ.....خوب صاف صفائی.....آخر اتنا کچھ ملازمہ تھوڑا ہی کرے گی.....

''تمہاری ملازمہ.....تو بہت اچھا کھانا بناتی ہے.....اُس نے شامی کباب کے ایک ٹکڑے کو منھ میں ڈالتے ہوئے کریدنے کے انداز میں کہا''۔

''کوئی ملازمہ ولازمہ نہیں ہے یار! یہ سب.....''

''اوہ تو بڑے شہر میں کھانا گھر گھر پہنچانے کا.....؟''

''نہیں میرے دوست! تم تو بال کی کھال نکال رہے ہو..... یہ سب میں نے خود ان ہاتھوں سے بنائے ہیں.....'' اُس نے فخریہ اپنا ہاتھ اونچا کیا۔ ''دیکھتے ہو ان ہاتھوں کو جس نے کم عمری سے سب کچھ خود اپنے ہاتھوں کرنا سیکھا ہے، کسی کا محتاج نہیں ہوں میں..... سوائے ایک اوپر والے کے اللہ کسی کا محتاج نہ بنائے.....''

اُس کی آواز میں اب کچھ درد بھی جھلک رہا تھا—— کھانے سے فارغ ہو کر ان لوگوں نے موضوع بدل بدل کر بہت طرح کی باتیں کیں۔ اُس نے سونے سے پہلے پوچھا۔ ''یہ تمہارا اچانک آنا کیسے ہوا؟ وہ تو غنیمت تھا کہ میں گھر میں تمہیں مل گیا ورنہ.....''

''تو تم گھر میں نہیں رہتے ہو.....؟''

''زیادہ تر..... وقت گزارنے کے لیے آفس کے بعد لائبریری میں چلا جاتا ہوں..... پڑھنے لکھنے میں دل اس طرح لگ گیا ہے کہ اس سے خوبصورت جینے کے لیے کوئی دوسرا سہارا نہیں..... اس شہر میں تو رات رات بھر لائبریری کھلی رہتی ہے۔ Full A.C. ہے..... کل تمہیں اپنا وہ گھر بھی دکھاؤں گا.....''

''جس نے تمہارے اس گھر کو بسنے نہیں دیا؟'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''اچھا یہ بتاؤ!..... وہ لڑکی کہاں گئی؟''

وہ ہنسنے لگا۔ ''تم بھی یار خوب ہو..... لڑکی اور عورت کے سوا—— ع

آہ بیچارے کے اعصاب پر عورت ہے سوار.....

''تو کیا علامہ اقبال عورت کی چاہت سے ایکدم پاک تھے کیا.....؟

''عطیہ فیضی کے ساتھ ان کے تعلقات۔ شبلی نعمانی نے بڑے دلکش انداز میں.....''

''چھوڑو یہ سب باتیں.....''

پھول کو پینے کی بات چاند کو چھونے کا قصہ.....

پھر اچانک اُسے خیال آیا کہ ابھی تو وہ ''چاند'' پر ہی ریسرچ کر رہا تھا—— آنگن میں جا کر اُس نے دیکھا چاند اپنے مدار میں جوں کا توں چمک رہا ہے..... ستارے بھی ٹمٹما رہے ہیں..... سب کچھ تو اُسی طرح ہے مگر..... مگر..... ماحول کے بدلتے ہی اندر کا احساس، دماغ کی سوچ بدل گئے ہیں..... اب چاند کے بجائے اُس کی دلچسپی کا محور اُس کا پُرانا دوست ہے جو ابھی ابھی آیا ہے اور کل صبح چلا جائے گا..... ایسے دوست اس کے یہاں برابر آتے اور جاتے رہتے ہیں، بعض تو کئی کئی روز رہ جاتے ہیں اور اس طرح وقت لینے لگتے ہیں کہ وہ اکتا کر اپنا گھر ان کے حوالے کر کے خود باہر چلا جاتا ہے۔

بستر پر دراز ہوتے ہوئے اس نے کہا:

''اس سفر میں میری بیوی بھی میرے ساتھ آنا چاہ رہی تھی مگر بچوں کے امتحانات قریب ہیں، اسی لیے میں نے کہا تم بعد میں چلنا—— اب تو مجھے برابر یہاں آنا ہی ہے.....''

وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا—— عورت کا استقبال اس نے ابھی تک کرنا

سیکھا نہیں تھا بلکہ وہ ان سے کچھ دور دور ہی رہنے میں عافیت سمجھتا تھا..... پتہ نہیں اکیلے گھر میں کسی عورت کو دیکھ کر پڑوسی کیا کہیں گے..... یہاں تو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں—— اس نے مسکراتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار بھی کر ہی دیا۔

''یار! تو ابھی تک میچورڈ (matured) نہیں ہوا ہے..... عورت سے اتنا بھاگتا ہے تو.....؟''

''بھاگنے کی چیز ہی ہے.....''

''کیوں؟''

''اس کیوں کا جواب میں نے کبھی نہیں تلاش کیا.....''

''کیونکہ ایسا خوبصورت موقع ہی تمہاری زندگی میں نہیں آیا.....''

''شاید ایسا ہی سمجھو!'' وہ خاموش ہو گیا..... مگر فکر مند بھی—— ذرا دیر بعد اُس نے پوچھا: ''کل صبح ناشتے میں تم کیا لینا پسند کرو گے.....؟''

''ناشتہ ہم لوگ اگر باہر ہی کر لیں تو کیسا رہے گا؟..... تم ناشتہ کی فکر نہ کرو!''

''یہ بات بھی ٹھیک ہے..... اور کھانا بھی باہر ہی لے لو گے کیوں؟''

''کیوں کہ لنچ میں تو میں..... بھی باہر ہی.....''

اُس کی بے تکلفی پر وہ مسکرا پڑا—— مگر.....

..... صبح جب آنکھ کھلی تو کچن میں کھٹر پٹر ہوتے سُن کر وہ اُسی طرف بڑھ گیا —— اُس نے دیکھا کہ وہ بریڈ، بٹر..... چائے لے کر ٹرے پر رکھ رہا ہے۔

''ارے یار! تم کب اُٹھے؟ اور ناشتہ تو ہمیں باہر کرنا تھا نا.....!''

وہ صرف مسکرا کر رہ گیا..... چائے کپ میں ڈھالتے ہوئے بولا: ''لنچ صرف باہر لیں گے.....ابھی تو وقت بہت ہے سوچا.....''

''تمہاری سوچ اور فعل میں.....''

''اسی لیے تو ابھی تک.....؟'' جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑا:

''گویا تمہیں بھی اپنی اس بے رنگ زندگی پر افسوس ہے.....!''

''بس کبھی کبھی.....تمہاری طرح نہیں کہ بغیر بیوی کے ٹور پر بھی جانا محال ہے!''

کوریڈور میں صُبح کا اخبار گرا ہوا تھا اسے اٹھاتے ہوئے اس نے بات جاری رکھی: ''اب تو میں بھابھی کو دیکھوں گا ضرور.....آخر کیا ہے اس عورت میں جو تم.....؟'' دونوں ہنسنے لگے۔

''تم نے شائستہ فاخری کا ناولٹ ''نادیدہ بہاروں کے نشاں'' پڑھا ہے.....؟''

''نہیں.....مجھے مطالعے کا نہ تو اتنا شوق ہے نہ وقت.....''

''آج تمہیں لائبریری میں پڑھنے کو دوں گا۔ آج تو تمہیں وقت ہے نا؟ پڑھ کر دیکھنا کہ عورت کس طرح مردوں کی زندگی میں ویرانی کا سبب بنتی ہے.....یار! وہ بہت اچھا لکھتی ہے.....ایک کڑوا درد ہے اس کی تحریر میں.....

''.....تو کیا عورت صرف گھر کی بربادی کا سبب بنتی ہے.....؟'' اُس کا لہجہ

تیز ہو گیا تھا: ''میں نہیں مانتا..... یہ ہم مردوں کی بڑی کمزوری ہے کہ ہم اپنے مدار سے اُسے..... گویا وہ مجبور و محکوم بن کر ساری عمر مدار کے اندر میں گھٹتی رہے..... اُس کی اپنی کوئی شخصیت اور پہچان ہی نہیں..... نہیں یہ ہماری فکر کی خرابی ہے.....''

''تم تو عورت کے طرف دار ہی نہیں اُس کے پرستار بن گئے ہو.....''

''جی ہاں! میں تو کہتا ہوں کہ.....'' اُس نے اپنی آواز کو اعتدال میں لاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی: ''.....عورت محض خوبصورت جسم کا نام نہیں ہے..... اُس کے پاس ہم مردوں سے زیادہ خوبصورت ذہن ہوتا ہے—— گھر اور باہر کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں بھی Activate کرتی رہتی ہے.....''

''بہت ہو گیا یار! عورت کا بکھان..... مجھ پر کچھ اثر ہونے کو نہیں..... جلدی کرو! آفس کا وقت ہو رہا ہے.....!'' ہنستے ہوئے اُٹھ کر وہ نہانے کے لئے چلا گیا.....

ذرا دیر میں..... غسلخانہ سے تیار ہو کر نکلا تو دور منڈیر پر ایک ننھی سی چڑیا چوں چوں کر رہی تھی۔ اسے اپنی طرف گھورتے دیکھ کر وہ ایک ڈبے سے چند دانے نکال کر بالکونی میں بکھیر دیتا ہے۔ دو چار چڑیا آ کر دانا چگنے لگتی ہے..... وہ سوچنے لگتا ہے کہ میرے یار کو جانور سے تو اس قدر پیار ہے مگر پیار کرنے والی چیز کو وہ اب تک نہیں سمجھ سکا ہے شاید! آخر اسے کس طرح.....؟

دس بجے کے قریب دونوں دوست ایک ساتھ نکلے۔ راستے میں دوست کا دفتر بند ملا تو وہ اپنے دفتر سے ملحق لائبریری میں پہلے داخل ہو گیا اور ''نادیدہ بہاروں

کے نشاں'' اُس کے ہاتھ میں تھما کر یہ کہتا ہوا نکل گیا کہ ''اب دو تین گھنٹہ آپ یہاں مطالعہ کیجئے..... ہم لوگ لنچ میں ملتے ہیں.....''

لنچ میں جب ملاقات ہوئی تو اس کا مہمان دوست کہہ رہا تھا: ''تمہاری قربت مجھے بے انتہا خوشی دے رہی ہے، اب دیکھئے جناب! آج میرا کام بھی نہیں ہوسکا ہے..... غالباً کل بھی مجھے ٹھہرنا پڑ جائے..... مجھے بلا کر وہ آدمی خود پتہ نہیں کہاں چلا گیا.....؟ اب شام میں.....!''

''کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے —— تمہارا گھر ہے تم جب تک چاہو قیام کرو..... بڑی مشکل سے تو یہ لمحے ملتے ہیں جب کوئی اپنا.....!''

رات کافی دیر بعد دونوں اِدھر اُدھر کی خوش گپیوں کے بعد اپنے اپنے بستر پر گئے —— تھک اس قدر گئے تھے کہ بستر پر جاتے ہی آنکھ لگ گئی۔

تقریباً نصف شب میں اُس نے دیکھا کہ ایک عورت بڑے پیار سے اُس کے دوست کے سرہانے بیٹھی ہوئی اس کے سر میں تیل ڈال رہی ہے..... وہ شاید تیز بخار میں ہے..... وہ خاموشی سے کچھ دیر تک اُسے دیکھتا رہا پھر اپنے بستر پر دراز ہوجاتا ہے —— صبح میں بھی وہ ناشتہ وغیرہ سے فراغت پا کر بیحد ہمدردی سے اُسے گھور رہی ہے اور اس کی بیچارگی پر ترس کھا رہی ہے..... اُس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا: ''بہت ہوگئی ہمدردی اور انسان دوستی، اب اپنی فکر بھی کیجئے میڈم!''

عورت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ''اپنی تو ہمیشہ ہی کرتی ہوں —— ہم لوگ ان کے مہمان بھلے ہیں مگر اس طرح انہیں اکیلے چھوڑ کر جانا کہاں کی انسانیت

ہے.....؟''

''.....میرا کام ختم ہو گیا ہے—— مجھے گھر جانا ہے'' لہجے کی کڑواہٹ کو محسوس کرتے ہوئے وہ بے دلی کے ساتھ سامان سمیٹ رہی تھی ..... پھر آہستہ سے بولی:

''بس ایک دن اور رُک جاؤ نا! کل چلے چلنا.....''

''کیوں.....؟''

''کیوں کہ وہ تیز بخار میں ہے.....''

شام کے سُرمئی اجالے میں وہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھی ہوئی اس طرح ہنس رہی ہے جیسے جلترنگ بج رہا ہو..... وہ پردا سرکا کر اک نظر ان پر ڈالتا ہے اور تیزی سے اندر چلا جاتا ہے:

''رشمی! رشمی! میں نے اسی لیے تمہیں یہاں لایا تھا.....'' اس کا بخار مہمان دوست کے سر پر چڑھ آیا تھا۔ آواز غصہ میں کانپ رہی تھی——

میزبان دوست اُس کے سرہانے کھڑا مُسکرا رہا تھا—— وقت دیکھنے کے لئے موبائل آن کیا اور دل ہی دل میں کہا..... ابھی تو آدھی رات بھی نہ گزری ہے، وہ سونے جا رہا تھا کہ—— پھر نہیں..... نہیں رشمی رشمی کی رٹ نے—— اُسے زور زور سے قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا۔ وہ جھک کر اس کے شانے کو جھنجھوڑ رہا تھا: ''یہ کیا نہیں نہیں رشمی رشمی'' کر رہے ہو۔ یہاں رشمی بھابھی کہاں ہیں.....''؟

''لا حول ولا قوۃ! میں خواب میں تھا.....''

وہ تو میں نے بھی محسوس کیا کہ سوتے جاگتے ہر وقت بھابھی آپ پر سوار

ہیں کس قدر خوش نصیب عورت ہیں —— وہ زیرِ لب مسکرا رہا تھا —— دوسری طرف اُس کا دوست کروٹ بدل کر سوچ رہا تھا تو کیا عورت اور مرد کے رشتے کی حقیقت اس قدر پھیپھسی ہے کہ خواب میں بھی ہم لڑتے اور جھگڑتے رہتے ہیں.....؟

دوسرے ہی لمحہ دل کی گہرائی سے ایک آواز آئی: اسی کو تو محبت کہتے ہیں.....

دوست نے پانی کا ایک گلاس اس کی طرف بڑھایا، وہ اٹھ کر پانی پی رہا تھا کہ کھڑکی سے باہر اس کی نظر گئی جہاں چاند اب مشرق سے سفر کرتے ہوئے مغرب کی طرف جھک آیا تھا مگر اب بھی وہ اپنے مدار میں ہی چمک رہا تھا —— شاید مدار سے باہر اُس کے لیے کوئی جگہ نہیں —— عورت بھی اپنے دائرے میں ہی اچھی لگتی ہے۔

چاند اور عورت کس طرح قدرِ مشترک کے حامل ہیں ——؟

☆☆☆

دھند

آج کئی دنوں کے بعد دھند چھٹ چکی تھی۔ سورج کی نرم نرم کرنیں دھرتی کو چھو لینے کے لیے بیقرار ہو رہی تھیں اس کا رکشہ جب کچہری چوک سے گذر رہا تھا تو مسکراتے ہوئے سورج کو دیکھ کر اس نے سوچا تھا۔

کاش! اس کی زندگی پر چھائی ہوئی دھند بھی اسی طرح چھٹ جاتی ..... کائنات واقعی کتنی حسین ہے، خدا کی نعمتیں لازوال ہیں ..... لیکن ایک بندۂ مجبور ..... ایک بندۂ مجبور کی تقدیر میں کیا ہے .....؟ یہ تو بس وہی جانتا ہے ..... وہی قادرِ مطلق ..... حاکم مطلق العنان ..... علیٰ کل شیءٍ قدیر، علی کل شیءٍ قدیر ..... آپ ہی آپ اس کے لب پر اس پاک کتاب کے اقوال زریں رقص کرنے لگے تھے۔

رکشہ دائیں بائیں مڑتا ہوا گھر کے قریب پہنچ چکا تھا اور وہ سوچ رہی تھی، گھر ..... گھر ..... کیسے رشتوں کے جالوں سے بنا ہوا ہے اس کا گھر ..... وہ ماضی کی یاد میں گم ہونا چاہتی تھی۔ پھر اس نے سوچا ماضی ماضی تھا —— کب کا وہ بیت چکا، بھلا پرانی یادوں سے چپکا رہنا بھی کیسی فضول عادت ہے۔ گذری بات صدی یا پل ہو، گذری بات تو ہے نقش بر آب۔ اسے اس طرح ذہن میں سجا کر نہیں رکھنا چاہئے کہ مستقبل کا

راستہ ہی مسدود ہو جائے۔ ایک صحیح الذہن انسان کو تو مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ حال سے رشتہ استوار کرنا چاہئے..... پھر وہ سوچنے لگی۔

کیا وہ فراریت پسند ہے جو ہمیشہ پیچھے کی طرف بھاگتی ہے..... جس کی حیثیت عارضی راحت کے سوا کچھ نہیں.....

''دیدی جی! اور آگے جائیں گی.....؟'' رکشہ ڈرائیور پیچھے گھوم کر سوالیہ نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

''ارے نہیں بھئی! تم تو آگے بڑھ گئے..... بس وہ پیچھے والی داہنی گلی.....''

قدرے خجالت کے ساتھ وہ بتا رہی تھی۔ ''تم سے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ٹھیک ہٹیا پر.....''

''آپ چپ تھیں تو ہم نے سمجھا کہ آپ کو اور آگے جانا ہے.....'' پھٹے پرانے کپڑوں میں مفلوک الحال رکشہ ڈرائیور اپنی سیٹ سے اتر کر ہینڈل کو پیچھے کی جانب گھما رہا تھا۔ اس عمل میں اسے خاصی تکلیف ہو رہی تھی اور وہ شرمندہ تھی کہ یہ سب پریشانی محض اس کی ذرا سی لاپروائی سے اسے اٹھانی پڑ رہی ہے۔ کاش! وہ ذرا پہلے ہوش میں آجاتی مگر چند لمحے پہلے تو وہ اللہ جانے کہاں کھو گئی تھی..... یہ کھو جانے کی عادت بھی عجب ہے اس کی۔ کالج کے زمانے میں اس کی سہیلیاں کہتی تھیں ''تم تو بنا ٹکٹ سیر کرنے کی عادی ہو.....'' وہ برجستہ جواب دیتی۔

''ہاں بھئی! کیوں نہیں اپنے ابا حضور ریلوے کے ملازم جو ہیں.....'' ابھی بھی وہ ماضی میں ہی گم تھی کہ رکشہ ایک جھٹکے سے رکا تو اس نے اپنے آپ کو مخاطب کیا:

''بی بی جی! گھر آ چکا ہے اب اترئے بھی.....'' یہ آواز رکشہ والے کی نہیں خود اس کی اپنی آواز تھی۔ پرس کا زِپ کھول کر اس نے پانچ کے کرکرے نوٹ کے ساتھ ایک اٹھنی فالتو رکشہ والے کو اس طرح دی جیسے وہ اس پر کوئی بڑا احسان کر رہی ہو۔ رکشہ ڈرائیور نے بھی بڑے ادب کے ساتھ سلام بجاتے ہوئے اپنے معاوضے کے ساتھ اس فالتو اٹھنی کو قبول کیا۔

سیڑھیاں چڑھ کر جب وہ اوپر آئی تو دروازے میں پڑا ہوا آہنی قفل اسے آج کی زندگی پر طنز کرتا ہوا معلوم پڑا..... گھر —— زندگی کے کسی مصروف ترین موڑ پر اس نے سوچا تھا ''چھوٹا پریوار، سکھی پریوار''۔ گھر سے کالج جاتے ہوئے اور کالج سے گھر آتے ہوئے بارہا اس کی نگاہ ہسپتال کے باؤنڈری وال پر چسپاں ''ہم دو ہمارے دو'' کے لال تکون پر فخریہ پڑتی اور وہ زیرِ لب مسکراتی..... لیکن یہ تو اس وقت کی بات تھی جب وہ مثل تتلیوں کے ہواؤں میں رقص کرتی تھی اور اپنے اندر سارے جہاں سے تنہا ٹکرا جانے کی ہمت پاتی تھی۔

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا۔

اس ڈھلتی ہوئی عمر میں انسان کیا چاہتا ہے؟ یہ بات اسے پہلے کہاں معلوم ہو سکی تھی.....

دروازہ کا قفل کھول کر سائیں سائیں کرتے ہوئے گھر میں جب اس کا پہلا قدم ہوتا تھا، پھر اس کی بچی اسکول سے آ جاتی تھی، اس کے خاوند دفتر سے آتے..... ملازمہ کام کرنے کے لئے آ جاتی..... اور کچھ ہی ساعتوں میں گھر کی رونق دوبالا

ہو جاتی تھی۔ اس وقت تنہائی کے لمحے اسے بے حد عزیز ہوا کرتے تھے۔ لکچر لکھنے لکھانے کا کام وہ ایسے ہی ماحول میں کرتی تھی، اس لئے وہ ہمیشہ کہتی "اللہ جانے لوگ باگ اکیلے پن سے کیوں گھبراتے ہیں، مجھے تو تنہائی بے حد پسند ہے۔ آدمی کا ذہن ایسے لمحوں میں خدا سے قریب ہو جاتا ہے"۔ اور وہ چند برسوں پہلے تک اپنے ماحول سے بالکل آسودہ تھی مگر..... مگر یہ ان دنوں اس کے اندر یہ کیسی تبدیلیاں آ رہی ہیں، وہ خود اس کا تجزیہ نہیں کر پا رہی تھی۔

اس نے آسمان کی جانب دیکھا، فضا پھر کہر آلود ہو رہی تھی، سورج نہ جانے کہاں گم ہو چکا تھا۔ متواتر کئی دنوں سے دھند آمیز اس فضا نے گھٹن کی سی کیفیت بنا رکھی تھی۔ سننے میں آیا کہ اب مسجدوں میں دعائیں اور مندروں میں مسلسل و متواتر پرارتھنائیں ہو رہی ہیں کہ سورج دیوتا جلد سامنے آئے اور سارے سنسار کو روشنی سے منور کر دے۔ روشنی، روشنی..... روشنی..... ہر طرف ایک ہی صدا تھی۔ اس کی زندگی کا سورج بھی تو ان دنوں گہرے دھند میں ڈوبا ہوا تھا..... نہ معلوم وہ کیسے ہوں گے.....؟ ایک لمحہ کو وہ شدید طور سے بے چین ہو اٹھی، اسے چھٹی لے لینی چاہئے تھی اور جلد سے جلد وہاں پہنچ جانا چاہئے تھا جہاں وہ متواتر کئی ماہ سے زیر علاج تھا۔ لیکن کئی ماہ کی مسلسل چھٹیوں کے بعد اب اس کے پاس کسی قسم کی کوئی چھٹی نہیں تھی اب بنا تنخواہ رخصت ہی وہ لے سکتی تھی۔ جو وہ چاہتے ہوئے بھی نہ لے پائی..... واقعی اب وہ کافی تھک چکی ہے، ذہنی جسمانی سبھی اعتبار سے ایک اندرونی انتشار تھا جس میں وہ بکھرتی چلی جا رہی تھی۔ کبھی اس نے سوچا تھا کہ ایک روز اپنی کڑی محنت سے وہ راستے کے تمام کانٹوں کو

چن لے گی اور ہر طرف پھول ہی پھول بکھیر دے گی۔ زندگی میں قہقہے اور مسکراہٹیں ہوں گی۔ وہ ہوگی اور اس کی تمنائیں اور آرزوئیں..... حسین خواب..... مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے کہ اس کے جیسا حوصلہ مند دل بھی فراریت پسند بنتا جا رہا ہے..... ان دنوں ملازم بھی مسلسل غیر حاضر ہے۔ شاید اس اجڑے ماحول میں اس کا بھی جی نہیں لگتا ہو، آخر وہ بھی تو آدمی ہے اور آدم زاد کی تلاش ہر آدمی کی پیدائشی جبلت ہے۔

دیکھتے دیکھتے دھند اس قدر چھا گئی تھی کہ دن میں بھی رات کا عالم تھا میلے میلے سے اجالے سے اسے بڑی کوفت کا احساس ہو رہا تھا جب کہ کبھی یہی منظر اسے بڑے رومانی معلوم ہوتے تھے۔ آدمی بھی اپنے احساس کے سہارے ہی جیتا ہے شاید، زندگی کا ہر رنگ احساس کے آئینہ میں دمک جاتا ہے۔

اس نے باہر کے تمام دروازوں کو بند کر لیا اور اپنے کمرے میں آ کر آرام دہ ڈنلپ کی مسہری پر دراز ہو گئی۔ آج کپڑے بدلنے کی بھی اس کی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں آج وہ خود کو بے حد تھکا ہوا اور بے بس محسوس کر رہی تھی۔ خواہش چائے کی ہو رہی تھی۔ ذرا دیر آرام کرنے کے بعد وہ اٹھی اور کچن میں گیس اسٹوو پر چائے کی کیتلی چڑھا کر، بند دریچے کے اس پار دیکھنے لگی لیکن شیشہ کے اس پار کی چیزیں اسے نظر نہیں آئیں کیونکہ لائٹ باورچی خانے کی چار دیواری میں قید تھی اور باہر کے ماحول کو تو اندھیرے اور دھند نے جکڑ رکھا تھا۔ شاید اس وقت باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ جاڑے کے موسم میں یہ ہلکی ہلکی بارش اور مستقل بدلی کا سماں ایک دو روز تک رہے تو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر مسلسل ایک جیسی صورت اور ایک جیسا موسم

اکتا دینے والا ہی ہوتا ہے۔ خاص کر ایسے وقت میں جب اندر سے بھی آدمی دھند میں مبتلا ہو گھٹن اور بوریت کا شکار ہو، اس نے سوچا کیا یہ گھٹن اور بوریت ہمارے عہد کا مقدر بن گیا ہے؟

''کیا اس دور میں انسان کی زندگی واقعی بیمار کی رات ہو گئی ہے.....؟ اس کی طرح کیا اور لوگ بھی ہراساں اور پریشاں ہیں.....؟؟؟ یا یہ سب اس کا انفرادی تجربہ ہے.....؟''

اب وہ ذات سے الگ ہو کر کائنات کے بارے میں سوچ رہی تھی، کائنات جو سمٹ کر ذات بنتی جا رہی ہے اور ذات.....؟ اس دور میں ذات کوئی معنی رکھتی بھی ہے یا اس کے وجود کا احساس ہی مطلقاً گھٹتا جا رہا ہے..... کل تک تو ہم اپنے لئے جیتے تھے مگر آج..... آج..... جینے کے لئے جی رہے ہیں شاید..... ہاں شاید یہی سچ ہے ..... مگر کیا اب بھی سچ اور جھوٹ کی تلاش باقی ہے.....

انہیں الجھی ہوئی سوچوں کے ساتھ اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ دن بھر کی تھکی ہوئی تھی، چائے کے گھونٹ دھیرے دھیرے حلق میں اتارنے کے بعد اسے قدرے آسودگی ملی تھی اور اپنے آپ اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں.....

ابھی تو رات کا پہلا ہی پہر تھا..... غالباً دس گیارہ بج رہے ہوں گے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اس نے لپک کر ریسور ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ لیکن آواز ندارد..... ذرا دیر انتظار کے بعد اس نے ریسور کو اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ رکھتے ہی پھر سناٹے گھر میں ٹیلیفون کی گھنٹی گونجنے لگی۔ اس نے بڑھ کر بیقراری سے ریسور ہاتھ میں اٹھا لیا..... دور سات سمندر

پار سے ایک موہنی آواز آ رہی تھی۔

''ممی! سو گئی تھیں کیا.....؟ پاپا کیسے ہیں.....؟.....تم کیسی ہو.....؟ فکر نہیں کرو ممی! پاپا کا بہتر سے بہتر علاج کراؤ، فی الحال میں دس ہزار ڈالر کے ڈرافٹ بھیج رہی ہوں.....نہیں ممی! میرا آنا ابھی ممکن نہیں ہے.....''

لائن کٹ چکی تھی اور وہ سوچ رہی تھی ''دس ہزار ڈالر کی ہوس نے کیا واقعی ہماری دنیا کو رنگین بنا دیا ہے یا ویران.....؟'' ایک سوال تھا جس کے حصار میں وہ لپٹی چلی جا رہی تھی.....؟ اندر اور باہر ہر طرف گہری دھند تھی۔

☆☆☆

معجزہ

قدرتِ خداوندی سے اس کے گھر میں بچوں کی کمی نہیں تھی، ایں قدر آں قدر سب ملا کر کل آٹھ عدد بچوں کا باپ تھا وہ۔ مگر اس بڑھاپے میں جب ان کی طرف نگاہ اُٹھاتا تو اُسے بڑی مایوسی ہوتی، ان میں سے ایک بھی تو ایسے نہیں جس پر وہ دل سے خوش ہوسکتا۔ کوئی ٹھگنا قد کا ہے تو کسی کا رنگ ایک دم سے سیاہ ہے، کسی کے ہاتھ پر لقوی کا اثر ہے، تو کسی کی آنکھ کج ہے، کوئی بُودی عقل کا ہے تو کوئی ہکلا کر بولتا ہے، گویا ایک عجیب دل شکن تماشا ہے جس میں وہ شب و روز گھرا ہوا ہے۔ شروع میں تو اُسے اتنا احساس نہیں ہوا لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا اُسے اپنی نامراد زندگی کا دُکھ کچھ زیادہ ہی ستانے لگا تھا۔ وہ بیوی سے بھی اکثر کہتا:

"..... یہ رنگ برنگے بچوں کی بھیڑ تمہیں کیسی لگتی ہے جی.....؟"

"اللہ کی مخلوق ہے....." بیوی مسکرا کر جواب دیتی۔ "جیسی بھی ہے مجھے تو پیاری ہے....."

"واقعی عورت ذات بھی قدرت کا ایک بے مثال نمونہ ہے، ہر دُکھ، ہر خوشی کو اتنی سادگی سے قبول کر لیتی ہے کہ کہیں کوئی بھید بھاؤ ہی اُسے محسوس نہیں ہوتا۔ یہ سوچ

کر وہ اپنے دکھی دل کو سمجھا لیتا..... واقعی بچے اللہ کی قدرت کی مثال ہیں، جسے نہیں ہیں اُن کے دل سے کوئی پوچھے..... مجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے.....'' پھر وہ گڑگڑا کر توبہ کرتا اور اپنے گناہوں کی تلافی دل سے چاہتا..... لیکن ادھر چند ماہ سے وہ برابر اخبارت کا مطالعہ کیا کرتا اور نئی نئی دواؤں کی تلاش میں اس کی نظر اخبار کے تمام ہیڈ لائنز پر ہوتی۔ چند ماہ سے وہ 'جین' سے متعلق میڈیکل سائنس کے نئے نئے انکشافات کا مطالعہ خصوصی دلچسپی سے کر رہا تھا۔ یہ تمام ریسرچ باہری ممالک میں ہو رہے تھے اور باضابطہ سائنسدانوں کی کمپلیٹ ٹیم کام کر رہی تھی۔ ان معلومات کو پڑھ کر اُسے لگا کہ اب تو ہر بیماری کا علاج ماں کے پیٹ سے ہی شروع ہو جائے گا اور 'جین' میں ہیر پھیر کر کے ہم اپنی من چاہی اولاد پیدا کر سکیں گے.....'' کاش! یہ انکشافات اور قبل ہوئے ہوتے.....'' اُس کے دل نے سوچا..... اُس کے گھر میں ایسے بچوں کی تعداد تو نہ بڑھتی جن کی خامیاں گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اُسے زیادہ محسوس ہو رہی ہیں..... اور آج کے تازہ اخبار میں اس سرخی کو دیکھ کر تو وہ حیران ہو گیا.....

''اب انسان کی بھی قلمیں'' یا اللہ! یہ آدمی نہ ہوا پیڑ پودھا ہو گیا۔ اُس نے اپنے بچپن میں آم اور امرود کے پیڑ میں قلم لگاتے ہوئے برابر دیکھا تھا۔ کس طرح ایک ننھی ڈال دوسری توانا ڈال کے ساتھ مل کر ایک بھرپور شکل اختیار کر لیتی ہے اور پھر پیڑ اچھے سے اچھا من پسند پھل دینے لگتے ہیں۔ یہ سب اُسے کبھی معجزات ہی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اس عہد کا معجزہ تو اور بھی غضب کا ہے..... واقعی یہ آدمی آج

عروج کی کس منزل پر پہنچ چکا ہے.....؟ اُس نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے اپنی شریکِ حیات کو آواز دی ''..... سنتی ہو جی! دیکھو سائنس کا کرشمہ..... وہ سامنے پھیلے ہوئے اخبار پر جھکا ہوا تھا۔

بیوی جب سامنے آئی تو اس نے نظریں اُٹھا کر کہا:

''..... دیکھو کیا لکھا ہوا ہے.....'' وہ پڑھ رہی تھی، حاشیے میں موٹے موٹے رنگین حرفوں میں لکھا ہوا تھا:

''..... بچے پیدا کرنے کے لیے اب استری پروش کا سمبندھ ضروری نہیں یعنی پرکھ نلی (Test tube) کے سہارے بچے پیدا ہو رہے ہیں، لیکن آج وگیان اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گیا ہے۔ اب پیڑ پودوں کی طرح منوش (آدمی) کی بھی قلمیں تیار کی جا سکیں گی، اور بھرن (نطفہ) سے اَن چاہے جین کو ہٹانے اور من چاہے جین کا ڈالنا بھی سنبھو (ممکن) ہوگا۔ اس تکنیک کے سہارے بانجھ مرد اور عورت بھی سنتان (اولاد) حاصل کر سکیں گے۔ فیگر کے لئے سترک رہنے والی اداکارہ، ماڈلنگ کرنے والی عورتیں بھی بغیر جھنجھٹ کے ماں بن سکیں گی .....'' (ہندوستان پٹنہ ایڈیشن ۱۴ر ستمبر ۲۰۰۰ء)

پوری نیوز پڑھ لینے کے بعد اُس نے مسکراتے ہوئے اپنے خاوند کو دیکھا اور دھیرے سے بولی ''چلئے اب مردوں کی برتری اور کم ہوئی.....''

''صرف مردوں کی ہی کیوں، عورتیں بھی تو ناکارہ ہو گئیں.....''

''سو تو ہے، ماں باپ دونوں کی اہمیت گھٹ گئی مگر بچے تو بے مثال ملیں

گے....."

عورت آہستہ لہجے میں کہہ رہی تھی تا کہ بچے ان باتوں کو نہ سُن پائیں..... کیونکہ بغل کے کمرے میں اُن کے بچے اودھم مچا رہے تھے۔ T.V. کھلی ہوئی تھی اور ان کا کوئی پسندیدہ سیریل چل رہا تھا، جس میں سبھی اس طرح ڈوبے ہوئے تھے کہ انہیں دنیا اور مافیہا کی خبر ہی نہیں تھی۔ بیوی پھر کچن میں چلی گئی، بات آئی گئی ہوگئی..... مگر مرد کا ذہن کئی روز تک اسی پہلو پر سوچتا رہا۔ یہیں تک نہیں، اُس نے اپنے کئی دوستوں سے اس کا ذکر کیا۔ باہر کے ممالک کے ریسرچ سنٹروں سے رابطہ قائم کیا اور کچھ دنوں کے بعد اچانک ایک روز وہ باہر جانے کے لیے تیاری کرنے لگا..... بیوی نے پوچھا:

"یہ اچانک پروگرام کیسے بن گیا.....؟" اس نے تمام باتیں اُسے بتانا مصلحت کے منافی سمجھا اور دفتری کاموں کے بہانے بنا کر فلائٹ کی ٹکٹ لے کر آ گیا.....

کئی ماہ امریکہ میں رہنے کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس کی صورت ہی بدلی ہوئی تھی، رنگ سرخ وسفید ہو رہا تھا، چہرہ پر تازہ خون دوڑ رہا تھا۔ اسکین (Skin) میں ایسی چمک تھی جو نوجوانوں کی پہچان ہوتی ہے..... اُس کے ساتھ ایک کم عمر عورت بھی تھی، اور سب سے عجیب بات یہ کہ ایک شیشے کا بڑا سا مرتبان جس میں ایک نہایت خوبصورت سا بچہ ہمک رہا تھا۔ مرتبان کے اُوپر ایک کنارے پر سنہری حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ "آئیڈیل بے بی".....

.....اُس نے بڑے پیار سے بیوی کے ہاتھوں میں مرتبان تھمایا اور آہستہ سے بولا ''جب تک تمہیں اس بچے کے بارے میں سب باتیں معلوم نہیں ہوتی ہیں یہ محترمہ تمہاری مدد کرنے کو لائی گئی ہیں.....'' اُس نے ڈرائنگ روم کے صوفے میں دھنسی ہوئی اُس غیر ملکی عورت کی طرف اشارہ کیا جو اس گھر کی ہر ایک چیز کو حیرت سے تک رہی تھی..... بیوی نے قدرے منہ پھلاتے ہوئے کہا:

''.....یہ اس بُڑھاپے میں تم نے یہ شوق بھی پورا کر ہی لیا.....توبہ ہے تم مردوں پر.....''

''کل کو بہت لوگ اس شوق کو پورا کرتے نظر آئیں گے.....ابھی تو ابتدا ہی ہوئی ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا.....''۔ وہ ایک دم شاعرانہ موڈ میں تھا، مگر بیوی پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ ذرا دیر پہلے وہ کتنی خوش ہو رہی تھی کہ اُس کا خاوند دنوں کے بعد آرہا ہے، کتنی تیاریاں کی تھی اُس نے۔ بچے سب اچھے اچھے کپڑے پہنے مہمان بنے باپ کے منتظر تھے مگر..... یہ شیشے کا مرتبان دیکھ کر سب اسی کو مستقل دیکھ رہے تھے۔

مرد نے دھیرے سے تنبیہہ کی: ''دیکھو میاں! شیشے سے ذرا دور ہی ہٹ کر رہو، بہت قیمتی ماڈل ہے.....'' عورت سوچ رہی تھی تو کیا اس ماڈل سے ہمیں وہ پیار ہو سکے گا جو ان ننھے منوں سے ہے..... جو اُس کے جسم کا خون ہیں، اُن کی آلودگیوں اور غلاظتوں کے پوتر بندھن.....؟ ''نہیں نہیں مجھے نہیں چاہئے یہ ڈیزائنر بے بی..... یہ ماڈل تم اس عورت کی معرفت وہاں بھیج دو جہاں سے خرید لائے ہو، مجھے نہیں چاہئے اس بُڑھاپے میں یہ سب جھنجھٹ.....''

''.....تم پاگل ہوئی ہو، جاہل عورت کو ان نئی سائنسی قدروں کی بھلا کیا قیمت معلوم..... اسی لئے تو میں نے اس بچے کے ساتھ اُس کی پوس پالک ماں کو بھی چند روز ـــ محض چند روز ساتھ رہنے کے لیے خرید لیا ہے.....''

''گویا اس دنیا میں اب ہر چیز خریدی جانے لگی ہے.....؟'' عورت بستر پر اوندھی ہوئی پیچ و تاب کھا رہی تھی..... مرد سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا تھا۔

''دیکھو یہ بچہ بہت نازک ہوتا ہے، ذرا سی چوٹ برداشت نہیں کر سکتا..... مگر جب بڑا ہوگا تو تم اس کی ذہانت دیکھنا، اس کی کارکردگی حیران کر دے گی تمہیں..... میں نے کئی ماڈل دیکھے، کئی جینوں کے بارے میں بھرپور واقفیت لی..... یہ بچہ ایک بڑا سائنسدان بنے گا..... اس میں امریکہ کے ایک غیر معمولی سائنسداں کا 'جین' شامل ہے..... بالکل چنندہ نمونہ ہے..... بڑی مشکل اور بھاری رقم خرچ کرنے کے بعد میں اس 'جین' کے حصول میں کامیاب ہوا ہوں..... تم میری محبت کی خاطر اس سے محبت کرنا سیکھو.....''

''محبت کرنا بھی کہیں سیکھا جاتا ہے.....'' عورت پاگلوں کی طرح ہنس رہی تھی، ''یہ مرد واقعی بالکل ادھوری عقل کا آدمی ہے.....'' پھر اُسے خیال آیا۔

''آخر اس لائی ہوئی مہمان عورت کا کیا قصور ہے جسے نہ تو ہماری زبان آتی ہے نہ ہماری تہذیب..... پتہ نہیں ہمارے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے اُسے پسند آئیں گے یا نہیں.....؟ چلو اُس سے ہی کچھ گفتگو کی جائے مگر معاملہ تو یہ ہے وہ صرف اشاروں میں بات کر سکتی ہے.....''

خیر بڑی مشکل سے چھ ماہ کی مدت ساتھ گذار کر وہ عورت جہاں سے آئی تھی وہاں چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد سب سے بڑی تبدیلی بیوی میں یہ ہوئی کہ وہ اب پہلے کی طرح بالکل نارمل نظر آ رہی تھی، نئے بچے کی دیکھ بھال بھی اچھی طرح ہو رہی تھی۔ ''پرانے زمانے میں سنا جاتا تھا کہ باہر جانے والے عورت (سوکن) لاتے تھے آج کے مرد بچے لا رہے ہیں، چلو ہم عورتوں کے لیے یہ قدم اتنا تکلیف دہ نہیں.....'' پھر وہ پہلے کی طرح ہنسنے بولنے بھی لگی..... بال بچوں سے بھی بھرپور دلچسپی لینے لگی..... گھر کی مجموعی فضا خوشگوار ہو چکی تھی، نیا بچہ تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا، غذائیں بھی بڑی مقوی تھیں اُس کی..... دیکھتے دیکھتے وہ ماں کی گود سے باہر لٹکنے لگا اور دوسرے بھائی بہنوں کے ساتھ اچھل کود کرنے لگا..... ماں باپ نے پیار سے اُس کا نام ایجاد رکھا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ایجاد میاں اچھے خاصے نوجوان بن گئے..... اُن کی ذہانت، اُن کی تیزی واقعی بے مثال تھی..... والدین کی نظروں میں ان کی اہمیت اب کافی بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ اپنے مستقبل کے تمام خواب وہ اس ایک اولاد سے پوری کر لینے کے متمنی تھے۔ مگر جوانمردی اور ذہانت کے ساتھ ایجاد میاں کی شرارتیں بے حد بڑھتی جا رہی تھیں۔ آئے دن وہ کوئی نہ کوئی نیا کام کر جاتے.....

ایک دن تو غضب ہی ہو گیا، چھوٹے بھائی کے سر کے عین بیچوں بیچ لوہے کی کیل ٹھونک کر اُس نے انہیں لٹو کی طرح زمین پر نچانا شروع کر دیا۔ وہ زور زور سے چلا رہا تھا..... کمرے میں خون کے فوارے بہہ رہے تھے اور بارہ سال کا لڑکا زمین پر لٹو کی طرح سر کے بل ناچ رہا تھا..... ماں نے جب دیکھا تو کلیجہ پیٹ کر رہ گئی.....

باپ فوراً بچے کو اُلٹ کر ہسپتال لے کر دوڑا مگر بہت کوشش کے باوجود لڑکا نہیں بچ سکا .....اس صدمے کو بہت دنوں تک ماں نے یاد رکھا اور اس بچہ پر اب اُن کی خصوصی نظر رہنے لگی، دن کا چین، رات کا آرام حرام ہو گیا.....

ایک دوپہر کو پھر ایک نرالا واقعہ ہوا..... وہ بے مثال بچہ اپنے سوئے ہوئے باپ کی لمبی سفید داڑھی میں کیروسن تیل کے ساتھ ماچس کی تیلی لگا چکا تھا کہ اچانک سب سے بڑے بیٹے کی نظر پڑی اور گھڑوں پانی سوئے ہوئے باپ کی داڑھی پر ڈال انہیں جلنے سے بچالیا.....اس واقعہ کے بعد ماں باپ دونوں ہی اس غیر معمولی ذہن کو لے کر پریشان تھے۔ باپ نے ریسرچ سنٹر میں خط لکھا۔ اس کے پیدائش کی پُرانی فائل ڈھونڈھ کر نکالی گئی مگر کچھ بھی نہ پتہ چل سکا۔ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے، ان لوگوں نے کہا لگتا ہے تربیت غلط مل رہی ہے، ڈیسپلین کی کمی آ گئی ہے، کچھ دنوں کے لیے کسی ٹریننگ سنٹر میں ڈال دیا جائے.....اُن لوگوں نے ایسا ہی کیا مگر وہاں بھی آئے دن نئی نئی شرارتیں.....سائنسدانوں نے کہا ''یہ غیر معمولی ذہنی قوت کی پہچان ہے، خود بخود کچھ عمر آنے پر ٹھیک ہو جائے گا۔ عمر کا یہ حصہ ہی ہلچل کا ہے.....''

''مگر دوسرے بچے.....؟''

''ارے جناب! ان بچوں سے اس بچے کا مقابلہ کیوں کرتے ہو، یہ اُن سے کئی گنا زیادہ ذہین 'جین' اپنے اندر لیے ہوئے ہے.....''

بیوی نے کلام پاک کی تلاوت کر کے اُسے جزدان میں ٹانگ دیا اور دوپہر میں ذرا دیر کو بستر پر آ گئی تو ایک عجیب سا خیال اسے ستانے لگا۔

''یہ ذہن جین کس انس کا ہے یا.....؟ اس کی حرکات تو یقیناً ابلیسی ہیں.....
اللہ توبہ کہیں میرے گھر میں.....'' وہ عجیب طرح سے کانپ رہی تھی کہ واقعی چند روز
بعد کسی سائنسداں نے باہر سے خط لکھا کہ:

''ہمیں افسوس ہے کہ مسٹر ایجاد کی جین کی آمیزش میں غلطی سے صرف
ایک جین ایسی شامل ہوگئی ہے جو ساری آفتوں کی جڑ ہے مگر اب کیا کہا جائے.....
آپ کہئے تو ہم اسے واپس بلا کر فوت کر دیتے ہیں اور اس کی جگہ آپ کو ایک بالکل
نیا اور تازہ ڈیزائنر بے بی دینے کو تیار ہیں.....ویسے بھی یہ نیا ماڈل پہلے ماڈل کے
مقابلے میں ہر لحاظ سے بہتر ہے.....آپ سے اب ہم اس کے لئے کوئی نئی قیمت
نہیں لیں گے کیونکہ یہ غلطی ہمارے ریسرچ سنٹر سے ہوئی ہے.....''

اس خط کو پڑھنے کے بعد دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو احمقوں کی طرح
دیکھ رہے تھے.....بچے گھر کے آنگن میں قہقہے لگا رہے تھے۔

☆☆☆

کٹی پتنگ

پتنگ کی ڈور اُن کے ہاتھوں میں تھی اور نگاہیں تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے نیلے آسمان کے سمندر میں ڈوبتی ابھرتی رنگین پتنگ پر..... سبک سبک سی، کسی ننھی سی جان کی طرح لامحدود وسعتوں میں ہولے ہولے ڈول رہی ہوتی، اس نحیف سی جان کی اس قدر بلند قوتِ پرواز پر وہ حیران تھے۔ ساتھ ہی ایک خطرہ بھی انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں مدِ مقابل آتی ہوئی ڈور اُن کی پتنگ کی قاتل نہ بن جائے —— اگرچہ اس وقت وہ ان سے دور بہت دور تھی، مگر اس بات سے انہیں بڑی طمانیت مل رہی تھی کہ وہ بہرحال اُن کی گرفت میں تو ہے اختیار کا یہ احساس بھی کس قدر فرحت بخش ہے۔

''ہنھ پاپا! اب دیجئے نا مجھے.....'' اُن کے سامنے کھڑے نو دس سالہ معصوم بچہ نے مچلتے ہوئے پاپا کے ہاتھوں میں گردش کرتے ہوئے اُچکا کو اُچک لینا چاہا۔

''ارے میاں! آپ سمجھتے کیوں نہیں؟ پتنگ ابھی لامحدود فضاؤں میں قلانچیں بھر رہی ہے اس وقت اگر ہم اسے اپنے اختیار میں نہیں رکھ سکے تو پھر اپنا سا منھ لے کر رہ جائیں گے.....'' پاپا نے ترنگ کے ساتھ اپنا جملہ مکمل کیا۔

''..... ننھے میاں! پتنگ بازی کے لیے بھی اندازِ شہنشاہی چاہئے.....''

''مگر پپا!''

''پپا وپا کچھ نہیں، ابھی جو میں کہوں، سنو——!''

پاپا کی آواز ایک حکمران کی آواز تھی، اس وقت وہ مطلق العنان بنے سب پر حاوی تھے—— کھلی فضا میں پتنگ کسی سبک خرام حسینہ کی طرح مچل رہی تھی۔ اُن کی نگاہ اس کی معمولی معمولی حرکت اور جنبش کو تول رہی تھی۔ انہیں خدشہ تھا کہ اگر اُن کی گرفت میں ذرا بھی کمزوری آئی تو یہ خوبصورت نازک اندام ان کی دسترس سے باہر نہ نکل جائے۔

لڑکے نے حسرت سے دور کھلے آسمان میں رنگ برنگی پتنگ کی طرف دیکھا۔ کوئی گلابی، کوئی نیلی، کوئی سبز، کوئی سُرخ، کسی کی دم لگی ہوئی..... کوئی بڑی اور کوئی نازک کمانی میں اٹھلاتی ہوئی بلندی کی طرف پرواز بھرتی ہوئی..... مگر پاپا تو ابھی خود کھیل میں مست تھے، اُن کی نظر اپنے معصوم بچے کے جذبات پر کہاں تھی؟ وہ تو ابھی کھلے آسمان میں اپنی اداکاری دکھانے میں مصروف تھے——

اچانک انہوں نے محسوس کیا کہ اُن کا ہاتھ کمزور ہو گیا ہے اور پتنگ نیچے کی طرف گرتی چلی آ رہی ہے۔ عنقریب وہ کسی مکان کی چھت پر یا پھر کسی کے آنگن میں جا گرے گی، بس اسی لمحہ انہوں نے ایک شاطر کھلاڑی کی طرح تیزی سے ہاتھ کو گھمانا شروع کیا اور پتنگ کو اپنے قریب کھینچ لینا چاہا تھا مگر توازن بگڑ چکا تھا—— اُن کی گرفت کمزور ہوتی جا رہی تھی، دیکھتے دیکھتے وہ خالی ہاتھ ہو چکے تھے، صرف ننھی سی ڈور ان کے ہاتھ میں سلامت تھی جو گم شدہ پتنگ کا احساس دلا رہی تھی—— تقریباً سو

گز کے فاصلے پہ کسی غیر کے آنگن میں پتنگ جا گری تھی، اس کیفیت کو دیکھتے ہی ملازم بچہ نہایت پھرتی کے ساتھ اس کی تعاقب میں دوڑا —— سڑک کے دیگر آوارہ گرد بچے بھی شاید اسی تاک میں لگے ہوئے تھے کہ کوئی پتنگ ڈور سے ٹوٹ کر گرے اور وہ اس کے ساتھ نوچ کھسوٹ کا برتاؤ شروع کر دیں —— یہ تماشا روز کا معمول بن چکا تھا۔ اس نعمت غیر مترقبہ کو لوٹنے کی آرزو لے کر بہت سارے آوارہ گرد بچے اچانک اُس آنگن میں آدھمکے۔ مگر ملازم بچہ بھی جائے وقوع پر پہنچ چکا تھا اور مالک کے رشتہ سے اُس پتنگ پر اپنا حق جماتے ہوئے اُن کے ہاتھوں سے زبردستی اسے چھین لے بھاگا۔ مگر ابھی نصف راستہ ہی طے کیا ہوگا کہ اچانک کسی خیال کے ذہن میں آجاتے ہی وہ اپنے دوست راجو کو پتنگ ہاتھ میں تھما دیتا ہے اور خود خالی ہاتھ صاحب کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے —— صاحب کے لڑکے نے اسے خالی ہاتھ دیکھ کر روہانسی ہو کر کہا:

''..... پاپا آخر آپ نے میری پتنگ .....'' اس معمولی سی پتنگ کے غم میں بچہ آبدیدہ ہو رہا تھا مگر پاپا نے کافی رعونت کے ساتھ جواب دیا۔ ''..... ذرا صبر کر میرے بچے، تیرے باپ کی جیب سلامت ہے تو دوسری پتنگ ابھی فوراً آسکتی ہے'' —— یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی جیب سے پانچ کے کرارے نوٹ نکال کر حکم دیا: ''اس سے خوبصورت پتنگ لے آؤ، میرے منے کے لئے'' —— واقعی ذرا سی دیر میں دوسری نہایت دل کش گلابی رنگ کی نازک کمانی دار پتنگ آگئی —— ہم عمر ملازم بچہ جو ابھی ابھی بازار سے اپنے صاحب کے لڑکے کے واسطے پتنگ خرید کر لایا تھا دل ہی دل

میں دعائیں کر رہا تھا۔

''یا اللہ! یہ پتنگ بھی اسی طرح ہم غریبوں کے حصہ میں آجائے.....'' اس کے دل میں ایک خطرناک گوہمن سانپ پھن اُٹھائے کھڑا تھا۔

بات سچ تو یہ تھی کہ اِدھر وہ منجھا کرتا تو شعوری کوشش یہی ہوتی کہ دھاگا مضبوط ہونے کی بجائے کمزور ہو جائے۔ اپنے دوسرے غلام ساتھیوں کو بھی اس نے جعل سازی کی یہ حرکت سکھا دی تھی تاکہ پتنگ آسانی کے ساتھ ان کے مقدر کی ساتھی بن سکے۔ ورنہ ان غریب بچوں کو بھلا کون؟..... وہ بچے جو اس کے اپنے طبقے سے متعلق تھے کسی کو وہ بھائی کہتا اور کوئی اسے ''بھیا جی'' کہتے —— ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں دور رہ کر بھی وہ کس قدر قریب تھے۔ اس بھائی چارگی کے احساس نے ان دنوں اسے اپنے کام کی جانب سے بے ایمان بنا دیا تھا۔ اب اُس کے کام میں وہ اگلے دنوں کی سی چستی اور وفا شعاری نہیں تھی —— حالانکہ چند سال قبل تک جبکہ وہ بچہ تھا اس کا دل و دماغ زیادہ وفادار تھا۔ ایک دن مالک نے ٹوکا بھی: ''ابے سالا! کیسا منجھا کرتا ہے.....؟ کیا انہیں دانتوں سے کتر دیتا ہے کہ جگہ جگہ ٹوٹ جاتے ہیں.....؟''

''نہیں ہجور (حضور) آج کل دھاگا ہی بہت کمزور ہو گیا ہے، منجھا کرنے ہی میں ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے.....'' وہ برجستہ جواب دیتا اور دیر تک اپنی حاضر جوابی پر اندر ہی اندر خوش ہوتا۔

''دھاگا کیا کمزور ہوگا —— بھلے تو کام چور ضرور ہو گیا ہے ——'' صاحب سنجیدہ نظروں سے اُسے گھورتے اور سوال کرتے۔

''آج کل تو کوئی بھی کام دل جمعی سے کیوں نہیں کرتا کلّو ــــ؟ اب تو تیرا درماہا بھی پہلے سے بڑھ گیا ہے.....؟؟''

''من نہیں لگتا صاحب جی'' اس کا دل چاہتا وہ سب کچھ سچ سچ بتا دے۔ مگر صاحب کی مار کے خوف سے وہ اپنے اندر کی بات کو اندر ہی اتار لیتا۔ لیکن کچھ دیر تک وہ اپنی اس تبدیلی کے بارے میں خود بھی سوچتا کہ آخر وہ وفا شعاری اور نمک خواری کے جذبات کو بھولتا کیوں جا رہا ہے جو اس گھر میں قدم رکھتے وقت اس میں تھے ــــ پتہ نہیں اس کے پیچھے قصور کس کا ہے۔ لیکن سچ تو یہ تھا کہ اب اس کے دل و دماغ میں مالک اور ملازم کا احساس جڑ پکڑ چکا تھا اور اس فرق کے ساتھ دوئی کا احساس بھی دنوں دن بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جیسے دونوں کا سرا ایک دوسرے کے ساتھ بندھا ہوا ہو ــــ اچانک صاحب کی آواز نے اس کی سوچ کا سلسلہ بکھیر دیا۔ وہ اپنے بیٹے سے فرما رہے تھے۔

''ارے میاں! کھیلتے ہو تو کبھی خود بھی ان کاموں میں دل چسپی لو، سب کچھ اس نکھٹو چھوکرے پر چھوڑ کیوں دیتے ہو؟ پتنگ وہی لائے، دھاگا وہی خریدے اور مانجھا بھی وہی کرے.....؟'' وہ دل میں سوچتا: اور کھیلے صرف مالک کا بیٹا..... ہنھ! کیا شان ہے ان بڑے لوگوں کی، اللہ بھی کس قدر خوش ہے ان سے ــــ سارے ٹھاٹ باٹ تو ان کے کدموں (قدموں) میں ڈال دیئے..... ایک وہ نصیب جلا ہے، بچپن میں ہی ماں مر گئی، بھوک مری سے تنگ آ کر باپ نے شہر لا کر سمجھو تو ان کے ہاتھوں میں بیچ ہی تو دیا ہے کبھی بھول کر بھی نہیں آتا..... صرف اس

کی کمائی پر اس کا حق ہے، ہر ماہ ڈاک سے اسے درماہا پہنچ جانا چاہئے —— کیا ان غریب باپوں کو اپنے خون کی بو بھی نہیں تڑپاتی .....؟ اس کے ننھے سے دماغ میں اکثر یہ سوال سر اٹھاتا اور جواب میں سوتیلی ماں کا قبیح چہرہ نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا —— آخر مالک کی گرج دار آواز نے ماں اور باپ دونوں کی شبیہہ کو گڈمڈ کر دیا اور صرف مالک ہی مالک نظر آنے لگا۔

''ابے حرامی کا پلّہ! تو یہاں کھڑے کھڑے اونگھ کیا رہا ہے، چل پتنگ کو پیچ دے —— اور وہ منٹوں میں ماضی سے حال میں چلا آتا، پتنگ لے کر دوڑتا ہوا چھت کی آخری چھور تک چلا جاتا، پھر پتنگ اوپر اور اوپر اڑتی چلی جاتی اور پتنگ کی اڑان کے ساتھ ساتھ اسے ایسا لگتا جیسے وہ بھی اوپر کھلی فضاؤں میں اڑتا چلا جائے۔ کاش! اُس کو بھی کوئی اُڑان بھر دیتا —— نیلے آکاش میں کیسی سندرتا ہے ——؟ کتنا بھلا لگتا ہے..... وہ حسرت سے اونچے آسمان کی طرف تکتا اور پھر زمین کو دیکھتا، جس میں وہ دھنستا ہی جا رہا تھا، مانو زمین کوئی دلدل کا میدان ہو، جہاں اس کے کمزور پاؤں کو ٹھوس پن کا احساس ہی نہیں ہوتا —— اسی لمحہ اسے لُوٹی ہوئی پتنگ کا خیال آیا جسے وہ راجو کے ہاتھ تھما آیا تھا۔ کہیں راجو اس زخمی پتنگ کی مرہم پٹی کر کے کھیلتے کھیلتے اسے ادھموا نہ کر چکا ہو۔ آخر وہ بھی تو کبھی کبھار کھیلنا چاہتا ہے، بلا سے سالم پتنگ اس کا نصیبہ نہ سہی، مگر لوٹ کے مال پر تو حق سب کا ہے —— وہ اکثر کٹی پھٹی پتنگ پر پتلے پتلے کاغذ تراش کر لئی سے چپکاتا، اُن میں دُم بالا لگاتا، کمانی درست کرتا اور دھوپ میں کچھ دیر سکھا کر تر و تازہ بناتا پھر کھلی فضاؤں میں پرواز بھرنے کے لیے ہواؤں کے دوش پر

چھوڑ دیتا ـــــ مگر ذرا سی دیر میں پتنگ نیچے چلی آتی۔ دراصل اس کے پاس اُچکا تھا کہاں جو پتنگ کو دور آسمان میں پہنچنے میں مدد دے۔ ایک دفعہ اس نے کچھ پیسے جمع بھی کیے تو مالکن نے وہ ڈانٹ پلائی کہ اُچکا خریدنے کے خیال ہی کو بھلا بیٹھا ـــــ ''بابو بن کر دن بھر گڈی اڑائے گا، مفت خورہ، حرام خور'' اور نہ جانے کیا.....؟

پتنگ اڑانا تو واقعی اس کے نصیب میں نہ تھا ـــــ ایک رات نیند میں البتہ بڑی شان سے وہ پتنگ اُڑا رہا تھا، اس کی پتنگ اوپر بہت اوپر جا رہی تھی، وہ خوشی میں زور زور سے اُچکا گھما رہا تھا اور وارفتگی کے عالم میں بلند ہوتی ہوئی پتنگ کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک کسی نے اس کی پتنگ کاٹ دی۔ وہ سِسک سِسک کر واقعی رونے لگا، اتنے میں مالکن کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی ـــــ وہ جھنجھوڑ کر اسے اٹھا رہی تھیں۔

''ارے کلو! صبح ہوگئی، اب جلدی سے اُٹھ بھی جا ـــــ'' آنکھ کھلی تو تھی اس نے دیکھا، وہ پتنگ اڑا نہیں رہا ہے بلکہ اس کی حیثیت تو خود ایک پتنگ کی سی ہے کمزور، ناتواں، ہواؤں میں ڈولتی، بے سہارا.....اور اس دن سنسان دوپہر میں اس نے اپنے ساتھی راجو سے پوچھا تھا۔

''یہ پتنگ بازی کا کھیل تمہیں کیسا لگتا ہے راجو.....؟''

''بڑا اچھا لگتا ہے کلو بھیا! مانو ہم نیلے آکاش میں اڑتے چلے جا رہے ہیں ـــــ'' کلو نے ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں کبھی تو یہ کھیل میرے من کو بھی بھاتا تھا۔ محض اشاروں میں پتنگ کو نچانا بڑا دلچسپ کھیل ہے مگر جیوں جیوں میں بڑا ہو رہا ہوں۔ مجھے اس معمولی کھیل کے اندر

ایک عجیب کھیل نظر آنے لگا ہے....." اس نے خالص فلسفیانہ انداز میں اپنی بات مکمل کی — راجو کو حیرانی تھی کہ صاحب لوگوں کے اثر سے کتنی جلد وہ اچھی طرح باتیں کرنا سیکھ گیا ہے — وہ کچھ دیر حیرت و معصومیت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اسے گھورتا رہا، پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔

"یار! آج کل تو کیسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے کھیل کھیل ہے بس میں تو اتنا ہی جانوں —"

"بس صرف اتنا ہی جانتے ہو —؟" کلو کے لہجے کی تلخی زہرِ ہلاہل بن چکی تھی۔ گویا وہ کہہ رہا ہو تم واقعی بالکل بدھو ہو اور جب تک ہم تم اس طرح بدھو بنے رہیں گے، نہ ہمیں پتنگ ملے گی اور نہ ہمارے اختیار میں اُچکا آئے گا — پھر اس نے دھیرے سے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"راجو تیرا دل کبھی یہ نہیں چاہتا کہ بڑے صاحب کے بیٹے کی طرح میرے اور تیرے ہاتھوں میں رنگین اُچکا ہو، رنگ برنگی پتنگ ہو —؟؟"

"میں بیوقوف نہیں ہوں، بھلا صاحب لوگ سے بھی کوئی مقابلہ؟"

"کیوں؟ صاحب بھی تو ہماری تمہاری ہی طرح دو ہاتھ پیر کے مالک ہیں، دیکھنے میں تو، تو صاحب کے لڑکے سے زیادہ پہلوان ہے..... پھر..... پھر؟؟"

"تم پر آج پھر پاگل پن طاری ہے میں چلا بابا اپنے گھر....." اس نے زبردستی بڑھ کر راجو کو دبوچ لیا —

"نہیں میں تمہیں آج جانے نہیں دوں گا۔ پہلے تم میری بات کا جواب دو

.....'' اس نے غصہ میں کہا۔

''میرے پاس تمہاری بات کا جواب..... بھلا تم ٹھہرے بڑے صاحب کے ملاجم (ملازم).....''

اِس آخری بات پہ کلو کو شدید غصہ چڑھ آیا۔ اس نے ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پہ رسید کیا—— ''یہ تم بار بار مجھے صاحب کا ملازم کہہ کر طیش کیوں دلاتا ہے ——؟''

''اس میں طیش آنے کی کیا بات ہے؟ کیا تم صاحب کے ملاجم نہیں ہو ——؟؟ کہہ دو میں گلط (غلط) بول رہا ہوں——؟؟؟''

کچھ دیر دونوں دوست بالکل خاموش رہے پھر کلو نے سر اُٹھا کر افسردگی سے کہا:

''ہاں تم ٹھیک بول رہے ہو، واقعی میں پاگل ہو گیا ہوں۔ میرا باپ مجھے ایسی جگہ کیوں ڈال گیا، جہاں میرے اندر کے تمام گھاؤ ہرے ہو رہے ہیں، میرے باپ کو تو صرف پیسہ چاہئے نا——؟'' وہ بچوں کی طرح سِسکنے لگا.....

''راجو تم نہیں سمجھو گے صاحب کا ملازم بن کر میں کتنا دکھ جھیل رہا ہوں —— ہر لمحہ بھیتر کوئی آگ، کوئی جوالا مکھی کھولتا رہتا ہے میں نہیں چاہتا راجو کہ ان بڑے آدمیوں سے الجھوں مگر بڑے آدمی کی کوئی بھی بات مجھے اچھی نہیں لگتی.....''

''.....مگر ہمارے کنبہ کے لوگ تو تم پہ رشک کرتے ہیں کہ تم اتنے اچھے گھر میں نوکری کرتے ہو، اتنا اچھا کپڑا پہنتے ہو، اچھا کھاتے ہو، بڑے سے گھر میں رہتے

ہو....."

مگر یہ سب میرا اپنا تو نہیں نا راجو، ان سب پر تو اس مالک اور مالک کے بچے کی چھاپ ہوتی ہے۔ اپنا تو کچھ بھی نہیں ہے اندر بھی خالی، باہر بھی خالی....." ننھے بچوں کی طرح سِسک سِسک کر بولتا رہا، میرا باپ..... میری آزادی جس نے چھین لی..... تمہیں دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آتا ہے جب میں گائے بھینس پر بیٹھ کر ہرے بھرے میدان میں دن بھر گھوما کرتا تھا اور اپنا پسندیدہ گیت کس شان سے گاتا تھا 'میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا.....؟' اور آج میں خود ڈنڈے کھاتا ہوں۔ صبح سے گئی رات تک مشین بنا کام کرتا رہتا ہوں۔ مگر پھر بھی ڈنڈا کھاتا ہوں، صبح سے رات تک کام..... بس کام..... کبھی کدھار کھلی فضا میں آتا بھی ہوں تو اس ڈری سہمی پتنگ کی طرح جس کی ڈور ہمیشہ کسی اور کے ہاتھوں میں ہوتی ہے——"

"——تو تم بھاگ کیوں نہیں جاتے؟"

"ہاں! میں بھاگنے کے لیے تو اکثر سوچتا ہوں مگر کیا بتاؤں یہ صاحب لوگ بہت ہوشیار ہیں، ہماری فوٹو پہلے دن کھنچوا کر اپنے پاس رکھ چکے ہیں——' اُن کا کہنا ہے کہ اِدھر تم بھاگے اُدھر ہم پولیس میں رپٹ درج کر دیں گے——' اور یار میں اپنے بھگوڑے ساتھیوں کا حشر بھی دیکھ چکا ہوں۔ یہ صاحب لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں، راجو....."

"تمہارے باپ سے بھی زیادہ جالم (ظالم) جس نے سب کچھ جان بوجھ کر تمہیں اس پنجڑے کا قیدی بنایا ہے——؟"

راجو کے اس آخری سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ تصویرِ یاس بنا اسے گھورتا رہا، اسی ایک سوال کے گرد دیر تک چکر کاٹتا رہا اور دل ہی دل میں سوچتا رہا۔

راجو ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے..... ایک دم سہی بول رہا ہے..... اس کی آنکھوں سے بے بسی کے ساتھ آنسو بہے چلے جا رہے تھے، جنہیں وہ اپنی میلی آستین سے پوچھنے کی انتھک کوشش کر رہا تھا——

☆☆☆

اجنبی دیار

وہ شہر جو ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا آج ہم سے اس قدر دور ہو گیا ہے کہ ہم اپنے شہر کو ہی نہیں پہچان پا رہے ہیں۔ اگرچہ شاہراہیں وہی ہیں، محلے کے نام بدل گئے ہیں مگر ہیں وہی۔ درختوں کے پتے بوڑھے ہو گئے ہیں مگر درخت وہی پرانے ہیں جب کہ درخت کاٹنے کا رواج اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اکثر درخت جڑ سے اکھاڑ پھینکے گئے ہیں مگر جو سالم ہیں ان میں وہی ماضی پوشیدہ ہے۔ پتا پتا کوئی کہانی سنا رہا ہے۔

اس دن کے بعد سے اسے لگا تھا جیسے اب اس کا وہاں کوئی نہیں رہا۔ وہ دھرتی بالکل اجنبی بن گئی تھی کبھی جس دھرتی سے اسے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ زمین کے رشتے کی پہچان بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ جب اس کے قریب رہو تو وہ ماں سمان اپنی آغوش پھیلا دیتی ہے مگر دور ہونے پر زمین اس قدر بے وفا کیوں ہو جاتی ہے؟ اس بات کا احساس اسے پہلے پہل اس وقت ہوا تھا جب وہ اپنے پاپا کے ساتھ ہجرت کے تجربے سے گذرتے ہوئے وطن کو خیر باد کہہ کر اجنبی دیس کو اپنا وطن قرار دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ایک لمبے عرصے تک کیسی توڑ پھوڑ تھی اس کے اندر..... سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ

ہونے کا احساس، بھیڑ میں بھی اکیلا پن، امیری میں غریبی و محرومی کا احساس..... مگر کچھ ہی دنوں کے بعد سارے مناظر پر سے پردا ہٹنے لگا اور وہ لمحہ کس قدر تکلیف کا تھا جب اپنے ہی وطن جانے کے لیے ویزا، پاسپورٹ، انٹرویو، بینک بیلنس کی ضرورت اور نہ جانے کیسے کیسے بکھیڑوں سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ ان بکھیڑوں سے گزرتے ہوئے دل اکثر کہتا..... ''نہ جانے میں ہی عافیت ہے۔ کون جائے اتنے جھمیلوں سے گزرنے.....'' مگر اندر کی خواہش سب پر غالب آجاتی اور وہ اندر اور باہر کے تناؤ سے بری طرح گھائل ہوتا رہتا۔

''سنتی ہو جی'' —— کیا سنوں —— وہ اکتا کر جواب دیتی۔ ''سوچتا ہوں عمر کی آخری گھڑی پر میں ایک بار وطن کا دیدار..... بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بڑبڑانے لگتی —— ''تم بھی عجیب ہو..... کتنے دن ہو گئے وطن چھوڑے ہوئے..... کہا نا کہ اب وہاں کوئی ہمیں پہچانے گا بھی نہیں.....! اس کے لہجے کی کڑواہٹ سے وہ تڑپ اٹھتا۔

''..... نہ پہچانے بلا سے..... دھرتی کی خوشبو مجھے بلا رہی ہے، میں تو جاؤں گا ہی''۔

''بنجر دھرتی خوشبو کہاں سے دے گی..... تم بھول گئے ان دنوں کو شاید''؟ ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے ''چلو اچھا ہے دکھ کی گھڑی کو بھول جانے میں ہی سکون ہے''۔

''سکون کہاں ہے؟ کیا تم اسے سکون کہتی ہو..... بھر پیٹ کھا لینا اور آرام

سے ہو جانا زندگی ہے.....؟؟''

''تو اور کیا چاہئے ایک عام آدمی کو.....؟''

میں عام آدمی نہیں ہوں جناب!..... مجھے کچھ اور چاہئے..... ہاں کچھ اور چاہئے..... ہم اندر کی تڑپ کو مٹا نہیں سکتے..... ہم ضرور جائیں گے وہاں..... وہاں کی مٹی ہمیں بلا رہی ہے..... میں روز رات سپنے میں جاتا ہوں وہاں..... آنکھ کھلنے پر اپنے آپ کو کتنا بے بس محسوس کرتا ہوں..... تم لوگ اس درد کو نہیں سمجھ سکتیں..... تم عورت ہونا——! دھرتی کا ہی ایک روپ..... جو ماں سمان بھی ہے اور محبوب بے وفا بھی.....

''.....تو جاؤ! ابھی چلے جاؤ!'' اس نے جھلا کر کہا تھا اور چادر تان کر سو گئی..... نومبر کی خنک رات تھی، نصف رات بیت چکی تھی مگر بوڑھے کو نیند نہیں آ رہی تھی..... ہندو پاک رشتے کی کامیابی پر وہ مسرور بھی تھا اور افسردہ بھی..... ایک عام آدمی کو رشتے کا یہ اپنا پن، کھلا پن نصیب ہو جب نا.....؟ وہ سوچ رہا تھا اور مسلسل سوچ رہا تھا کیسے اس پار جایا جائے۔ خرچ کا جگاڑ تو وہ کر چکا ہے، تحفے تحائف بھی خریدے جا چکے ہیں مگر قانونی کارروائی کس قدر طویل ہے کہ ابھی تک پوری نہ ہو سکی ہے۔ اس نے سوچا پہلے پہل وہ وہاں اکیلا ہی جائے گا، پتہ نہیں وہاں کے کیا حالات ہیں اب؟ سنی سنائی باتوں پر بہت بھروسہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ویزا مل جانے کے بعد جب اس نے گھر میں قدم رکھا تو گھر والوں نے الٹی سیدھی کہانیاں سنانی شروع کر دیں اور اس کے ارادے میں رخنہ ڈالنا شروع کیا۔ مگر

وہ بھی دُھن کا پکا نکلا۔ دوسرے ہی دن ٹکٹ بھی خرید لی، اور جانے کی تیاری میں اپنے تمام دوستوں کے پتے نوٹ کرنے لگا۔ فون پر نمبر ملاتے ملاتے وہ صبح سے شام تک پریشان تھا۔ یہ دیکھ کر اسے خوشی ہوئی کہ لوگ اس کی آمد کے منتظر ہیں، ابھی دنیا میں کچھ وفادار زندہ ہیں —— کچھ عرصے میں تو واقعی وہ اجنبی بن جائے گا وہاں کی زیادہ تر تو پہچانی ہوئی صورتیں ہجرت کے کرب سے گذر چکی ہیں، تو سب کے حالات ملتے جلتے ہی ہیں کیا.....؟ پھر وہ اپنے اوپر کیوں غم کرتا ہے۔ یہ درد تو کسی ایک کا نہیں۔ اس کے بھوگی تو انیک ہیں.....

ٹرین میں جب وہ بیٹھا تو بہت خوش تھا مگر دل دھڑک رہا تھا۔ اس عمر میں اکیلے سفر بھی تو گھبراہٹ کا باعث ہے۔

سرحد پار کرتے ہی اس پر ایک عجیب ولولہ تھا، ایک عجیب وارفتگی تھی، دیار عشق میں پہنچنے کی بیتابی، دھان کی جھومتی بالیاں، صبح کی خوشگوار ہوا کے جھونکے، چڑیوں کی چہچہاہٹ، جانوروں کے گلے میں پڑی پیتل کی گھنٹیوں کی مدھر آواز —— یہ سب کچھ عجیب رقص کا منظر پیش کر رہے تھے.....

دہلی پہنچ کر وہ سیدھے آگرہ کے لیے ٹرین پکڑنا چاہ رہا تھا کہ اسٹیشن پر ہی اچانک فون آیا جس سے خبر ملی آگرہ میں ہلکا پھلکا فساد ہو گیا ہے —— وہ ابھی آگرہ نہ پہنچ کر کچھ روز دہلی میں ہی قیام کر لے..... بادلِ نخواستہ اس روز اسے دہلی میں ہی قیام کرنا پڑا..... ہوٹل میں ٹھہرنے سے تو اچھا ہے کہ کسی دوست کے یہاں ٹھہرا جائے۔ ڈائری نکال کر دہلی کے ایک پرانے دوست کا نمبر ملایا..... گھنٹی ہوتی رہی مگر

بات نہ ہو سکی..... ممکن ہے کہیں باہر ہو..... ڈائری کے اوراق پلٹتے پلٹتے نوئیڈا کا ایک نمبر ملا..... اس نے نمبر جیسے ہی ڈائل کیا دوسری طرف سے 'ہلیو' کے ساتھ ایک نسوانی آواز گونجی۔

"..... آپ کون ہو بھئی جی.....؟" نام پتہ بتانے کے بعد جواب ملا۔

"ہاں جی!" لمبی طرحدار آواز میں: کہانا کہ میں نے اپنے پتی دیو سے آپ کا نام کبھی سنا ہی نہیں ہے۔ اور آپ کہتے ہو کہ پرانا ساتھی ہوں..... بہت اصرار کرنے پر بجھی ہوئی آواز میں جواب ملا..... کہانا بھئی! شام کو آنا..... میرے پتی اس لمحے گھر میں نہیں ہیں..... ایک پردیسی کو ہم کیسے..... آپ سمجھتے کیوں نہیں.....؟ یہ کہتے ہوئے جھنجھلاتے ہوئے فون رکھ دیا گیا —— اس نے سوچا ایسی حالت میں کسی غیر کے یہاں ٹھہرنا بھی مناسب نہیں ہے..... چلو اچھا ہوا، کچھ مصلحت ہی ہوگی..... ایک دو دن کا تو معاملہ ہے ہوٹل میں ہی قیام کر لیا جائے..... لیکن ہوٹل کے بارے میں بھی تو اب کوئی Idea نہیں رہا۔ اتنے سالوں بعد تو سب کچھ بدلا بدلا لگ رہا ہے..... پھر ڈائری کھولنے کے بعد ایک نیا نمبر دہلی کا ہی ملا..... ڈائل کرتے ہی بڑا پُر تپاک استقبال ہوا.....

ارے تم! اسٹیشن پر ہی میرا ویٹ کرو۔ میں ابھی آدھ گھنٹہ کے اندر تمہیں لینے آرہا ہوں.....

کچھ دیر بعد پھر موبائل کی گھنٹی بجی: یار! "میں تمہیں پہچانوں گا کیسے؟ بہت دن ہو گئے تمہیں دیکھے ہوئے..... اچھا اپنا حلیہ بتاؤ..... ہاں سنو پلیٹ فارم نمبر ۸ پر

کتاب کی دکان کے پاس سیاہ سوٹ اور سرخ ٹائی میں ..... بس بس ذرا دیر اور انتظار کرلو، میں آ ہی رہا ہوں یار جانی ——"

وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ آج بھی اس کے دوستوں کے دلوں میں اس کی جگہ ہے۔ ایک غریب الوطن اپنے وطن ..... میں اجنبی نہیں رہا ..... گاڑی میں بیٹھ کر لمبی لمبی گفتگو کے بعد ٹریفک جام میں گھنٹوں وقت گنوا کر جب دوست کے فلیٹ میں پہنچا تو اسے لگا کہ دلی جتنا بڑا شہر ہے، رہنے کی جگہ اتنی ہی تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ شاید اسی لئے بڑے شہر میں لوگوں کے اخلاق سکڑتے جا رہے ہیں —— نہ آنگن، نہ ورنڈا ..... روم بھی چھوٹے چھوٹے مگر رہنے کے انداز میں نفاست اور سلیقہ بدرجہ اتم ہے/ بچے بیوی بھی کس قدر مہذب ہیں ..... وہ پہلی نظر میں ہی ان سب کے لیے احترام وعقیدت کے جذبے میں ڈوبا جا رہا تھا —— شاید اس کی یہ کیفیت اس لیے بھی تھی کہ وہ دن بھر شدید ٹنشن میں رہا تھا ٹرین سے اتر کر اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اچانک بیچ سمندر میں غوطہ کھانے کے لیے تنِ تنہا چھوڑ دیا گیا ہو، اب وہ اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ دو چار روز یہاں آسانی سے قیام ہو جائے گا .....

دیر رات گپ بازی اور پرانی یادوں کے جھولے میں جھولنے کے بعد اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ صبح دیر میں اس کی آنکھ کھلی، اندر سے دھیمی نسوانی آواز تھی۔ "آگرہ میں فساد ہو گیا ہے، نہ جانے کب تک یہ حضرت .....!" آہستہ بولو میری جان! یہ مرد کی آواز تھی جو اس کا قریبی دوست تھا۔ عورت نے جھنجھلاتے ہوئے کہا: بڑے شہر میں رہنا بھی عذاب ہی ہے، یہاں تو روز ہی یہی سلسلہ .....

''.....ارے کل یہ چلے جائیں گے گھبراؤ نہیں.....بس آج بھر.....''

لمبی ہوں، کے بعد بیوی خاموش ہوگئی تھی۔ شاید اس نے اس کے چپل گھسیٹنے کی آواز سن لی تھی——

نہا دھو کر ناشتے سے فراغت پانے کے بعد اس نے اپنے دوست کو بتایا کہ کل صبح سویرے وہ یہاں سے آگرہ کے لیے روانہ ہو جائے گا''.....لیکن صبح میں آگرہ کے لیے اچھی ٹرین نہیں ہے۔ شام میں بلکہ دیر رات میں یہاں سے ٹرین کھلتی ہے..... اب جیسا تم سمجھو——!'' تو گویا آج رات میں ہی جانے کا صریح اشارہ ہے اس نے حیرت سے سوچا۔ اپنے دوست کے آفس جانے کے بعد وہ تنہا بستر میں لیٹا کروٹیں بدلتا رہا۔

.....یہاں مجبوری کا قیام.....اور وہاں دل کا طوفان.....اپنے پرائے سے ملنے کی تمنا دل میں موجزن تھی.....ٹیلیفون پر بات کر کے بڑا جھٹکا لگا اسے..... آگرہ اس کا وطن عزیز.....وہاں کا تاج محل، ممتاز محل کی محبت کا یادگار تاج.....دنیا کا ایک شاہکار فنی نمونہ.....جس کا تذکرہ وہ بچپن سے سنتا آرہا تھا.....ٹی وی اسکرین پر .....سینما کے پردے پر تاج کا مشاہدہ اسے اکثر دیوانہ بنا دیتا تھا۔ آج انہیں قریب سے دیکھنے وہ جا رہا تھا.....مگر.....مگر.....

''.....کہیں اور قیام بھلا کیسے ممکن ہے.....بہت سارے قانونی بکھیڑے، چھٹی اور ویزا کا پرابلم.....اس نے فون دوبارہ لگایا: ''بھئی! میں آنے کے لیے مجبور ہو رہا ہوں، تم لوگوں کے بغیر وقت نہیں کٹ رہا ہے.....تم کوئی انتظام کرو! میں آج

رات..... ہاں صبح سویرے....."

"..... اللہ مالک ہے آجاؤ!" اسٹیشن پر پہنچتے ہی ذرا دیر میں وہ تاج اکسپریس میں سوار ہو جاتا ہے۔ دوست نے اپنی طرف سے ٹکٹ خرید کر دیا تھا اور اپنے جذبۂ محبت کا اظہار اس طرح اس نے کیا تھا یار! تم خوش نصیب ہو جو خالی برتھ مل گئی ہے..... ورنہ اس ٹرین میں اتنی بھیڑ رہتی ہے کہ..... شکریہ کہہ کر وہ ٹرین کھلتے ہی آرام دہ برتھ پر لیٹ گیا لیکن اسے نیند نہیں آرہی تھی ایک عجیب گھبراہٹ تھی۔ آگرہ پہنچ کر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے ..... گھر سے بات ہوئی ذرا دیر ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد رپورٹ درج کرانے کی فکر میں پریشان نظر آنے لگا۔ اس کے بڑے بھائی کہہ رہے تھے کہ "تھانا میں رپورٹ درج کرانی بہت ضروری ہے، ورنہ....."

اچھا تو فوراً چلیے۔ وہ باہر کو نکل گیا فوراً۔ راستے میں تاج محل، اسے نظر آیا اور وہ اس کے گنبد کو دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی اک جذبۂ بے اختیار شوق کے ہاتھوں ڈرائیور سے کہہ کر ٹیکسی کو ذرا دیر کے لیے ادھر موڑ دینے کے لیے کہتا ہے۔

"صبح کی ٹھنڈی ہوا میں مزا ہی کچھ اور ہے، واپسی میں دھوپ کی تیزی بڑھ جائے گی..... دل میں ایک خیال آیا ذرا دیر 'تاج محل' کے دیدار کے بعد وہ تھانے پہنچ گیا تھا وقتِ مقررہ سے کچھ دیر ہوگئی تھی۔ پہنچتے ہی غضبناک نگاہوں نے اس کا استقبال کیا۔ لہجے میں انتہائی کڑواہٹ تھی۔

"..... سمئے کا بھی آپ لوگوں کو دھیان نہیں رہتا ہے، صبح سے آئے ہوئے ہیں اور رپورٹنگ کرانے لنچ آور (Lunch Hour) میں پہنچ رہے ہیں؟ گھڑی دیکھتے ہوئے

اس نے کہا: ''تاج دیکھنے میں ذرا دیر ہوگئی بھیا! یہ میرا وطنِ عزیز ہے نا، یہاں کی ہر چیز ہمیں اپنی طرف ..... اس کے لہجے میں التجا اور پریم رس کی مٹھاس تھی، مگر دوسری طرف آواز میں کرختگی اور انتہائی جھنجھلاہٹ تھی۔ ''تو جایئے تاج ہی کیا پورا شہر گھوم آیئے!'' دوسرا آدمی جو ذرا دور کرسی پر بیٹھا ہوا تھا بولا۔ ''تو بیٹھئے اب شام تک ..... آپ لوگوں کو نیم اور کانون کا النگھن کرنے میں مزا آتا ہے.....''

یہ آواز پہلی آواز سے بھی زیادہ کرخت اور دھماکہ خیز تھی——

''.....ہم اپنی غلطی پر اکسکیوز تو پیش کر رہے ہیں جناب! لمبی سانس کھینچتے ہوئے اس نے کہا۔ بات ذرا سلیقے سے کیجئے ہم پردیسی سے۔ اس نے اب ذرا مسکراتے ہوئے دل جیتنے کی کوشش کی مگر یہاں تو الٹا ہی اثر ہوا۔

''.....بہت بنتے ہو جی! ایکدم خاموش ہو جایئے ..... آنکھیں غصے میں انگارہ بنی ہوئی تھیں ابھی سلاخوں میں بند کر دوں گا تو ساری وطن پرستی ہوا ہو جائے گی جناب کی!

مستقل تو تو میں میں سے الجھتے ہوئے اب اس پر جھنجھلاہٹ طاری ہونے لگی تھی:

''.....آپ لوگ آدمی کو پہچانتے بھی نہیں ہیں ..... سب کو ایک ہی ڈنڈے سے ہانکنے کے عادی بن چکے ہیں ..... اس کی تیوری پر بھی بل آ چکے تھے ..... گرمی کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔

''.....ایں، کیا بولا تم ..... بولو کیا بولا! میں تمہیں ڈنڈے سے ہانک رہا ہوں

.....؟؟

تھانے دار کی آنکھیں غصے سے باہر ہو رہی تھیں..... وہ اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ ''ارے سنتے ہو سپاہی.....!''

''.....جی جور (حضور)!'' سپاہی ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

''ای جنٹول مین (Gentleman) ہم کو سلیکا (سلیقہ) سکھاوت رہین، سچ جھوٹ الزام لگاوت رہین'' موچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے: ''اپن کرسی کا اپمان ایگو پردیسی کرے گا۔ ای ہمت——؟

''نہیں حضور نہیں.....'' اُس نے گڑگڑاتے ہوئے عاجزی دکھائی۔ غصے سے لال بھبھوکا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ''ذرا انہیں حوالات کی سیر کرادو، بڑے آئے ہیں وطن کی سیر کرنے۔ اس عمر میں بھی رومانی بنتے ہیں، انہیں معلوم نہیں کہ روزانہ ایسے ایسے دہشت گردوں کے فلمی ڈائلاگ سنتے سنتے ہمارے کان پک چکے ہیں.....'' کرسی کو زور سے کھینچ کر بیٹھتے ہوئے:

''.....دہشت گرد اور وطن پرست..... یہ چھلاوے کسی اور کو دینا بھیا!''

اس کے چہرے پر ایک عجیب کریہہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی——

سپاہی جب اس کے ہاتھوں میں زنجیر پہنانے لگا تو واقعہ کی سنگینی کا احساس اسے ہوا اور اس کے قریب کھڑے رشتے کے بھائی کو بھی لگا کہ کھیل مذاق میں معاملہ کافی بگڑ چکا ہے اب اسے صرف ایک ہی راستہ نظر آیا فرار کا.....

''.....ڈھیر ساری رقم تھانے دار کے حوالے کر کے یہاں سے مجرموں کی

طرح بھاگ نکلنا چاہئے.....''

اس خیال کے آتے ہی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بھائی بھی غائب تھا۔ شاید وہ کسی سفارشی کو بلانے یا روپیہ لانے گھر گیا ہو، اس نے سوچا اور بے بسی کے ساتھ اپنے حالات کا جائزہ لینے لگا۔ سپاہی نے رحم و کرم کی تمام بھیک کو مسترد کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں آہنی ہتھکڑیاں پہنا دی تھیں اور بات ہی بات میں ایک وطن پرست —— مجرم کی صورت کٹہرے میں کھڑا تھا۔

☆☆☆

★ ڈاکٹر قمر جہاں نے اپنی تخلیقی توانائی سے کہانیوں کی دنیا میں اور اپنے علمی انداز نظر سے تنقید کے میدان میں ایسی شمع روشن کی ہے جس کی روشنی دیر تک باقی رہے گی۔

پروفیسر عنوان چشتی

★ افسانہ ہو یا تنقید دونوں فنون سے قمر جہاں انہماک اور لگن کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مجھے امید قوی ہے کہ ان کی یہ کتاب ادبی حلقہ میں مقبول ہوگی۔

پروفیسر علیم اللہ حالی

★ ''قمر جہاں'' نئے افسانوں کی ایک معتبر آواز ہیں۔ نئی افسانوی روایت میں ایک ایسا نام ہے جسے یکسر نظر انداز کر دینا ممکن نہیں۔ شدید حسیت سے مملو نئے افسانے یا ایسے افسانے، جہاں نئے انسان کے حسی تجربوں کا اظہار ہو قمر جہاں کی افسانہ نگاری کی خصوصیت بھی ہے اور انفرادیت بھی۔

نئی افسانہ نگاری ایک بحر ذخار سے کم نہیں مگر اس بحر ذخار میں ان قطروں کی کمی نہیں، جو اپنے آپ میں سمندر کوش ہیں یا کسی صدف میں پوشیدہ گوہر کی طرح اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن۔۔۔۔۔ قمر جہاں، ایسا ہی ایک نام ہے، جس پر واقعی ناقدوں کی توجہ کم ہے اور یہ ادبی سطح پر ناانصافی ہی کہی جائے گی۔ بہر حال یہ افسانوی مجموعہ، نئے افسانوں کی تنقید کا ایک اہم موضوع یقیناً ہے۔

ڈاکٹر خورشید سمیع

★ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ۱۹۸۰ء کے بعد بہار کی خواتین فنکاروں میں جن شخصیتوں نے اپنی تخلیقی اور تنقیدی توانائی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے اپنی شناخت بنائی ہے ان میں ڈاکٹر قمر جہاں کا نام نمایاں ہے۔ موصوفہ نے کئی جہتوں سے ادب کو مالا مال کیا ہے۔ ایک طرف آپ اپنے طرز کی معروف افسانہ نگار ہیں تو دوسری طرف اردو تنقید نگاری میں اپنی بیباکی اور غیر جانبدارانہ رجحان اور رویے کے لیے جانی پہچانی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر منظر حسین

★ ''فن اور اسلوب دونوں لحاظ سے وہ منفرد اور کامیاب ہیں، ان کی افسانوی دنیا ہی ایک متوازن راہ ہے جہاں روایت، ترقی پسندی اور جدیدیت کا مفاہمانہ امتزاج پایا جاتا ہے۔'' (از شیشہ افکار)

ڈاکٹر کہکشاں پروین

PINJRE KA QAIDI

Short Stories

By : Dr. Quamar Jahan

Printed : Saima Publication, Dariyapur, Ahmad Market, Patna-4